## بے حسی اور خود غرضی کی بدترین مثال

ایک جانب ملک کے ڈیفالٹ ہو جانے کے خطرات سر پر منڈلا رہے ہیں تو دوسری جانب حکومت میں شامل کچھ بے حس اور خود غرض عناصر اس کوشش میں ہیں کہ ملک کی نیا ڈوبنے سے پہلے پہلے مزید لوٹ کھسوٹ کر لی جائے۔ اس میں وزارت منصوبہ بندی پیش پیش ہے۔ رپورٹ کے مطابق وزارت منصوبہ بندی نے سالانہ ترقیاتی بجٹ میں کٹوتی کے بجائے اضافے کی درخواست کی ہے۔ پاکستان کے دیوالیہ ہو جانے کے خطرات کے باوجود مجوزہ عام انتخابات کے تناظر میں کھلے اخراجات کے لئے وزارت منصوبہ بندی نے وزیراعظم آفس سے رابطہ کر کے 727 ارب روپے مالیت کے سالانہ پبلک سیکٹر ڈیویلپمنٹ پروگرام میں اضافے کی درخواست کی ہے۔ دستاویزات کے مطابق رواں مالی سال کے دوران کئے گئے 119 ارب روپے کے ترقیاتی اخراجات میں سیاسی نوعیت کے منصوبوں کو زیادہ حصہ دیا گیا۔ وزارت منصوبہ بندی کی جانب سے وزیراعظم آفس کو بھیجی جانے والی سمری میں درخواست کی گئی ہے کہ فنانس ڈویژن کو رواں مالی سال کے دوران 727 ارب روپے مالیت کے "پی ایس ڈی پی" میں کوئی کٹوتی نہ کرنے اور اس کی رقم میں معقول اضافہ کرنے کی ہدایت کی جائے۔ جبکہ گزشتہ دنوں وزارت خزانہ نے آئی ایم ایف کو بتایا تھا کہ قومی اسمبلی کی جانب سے رواں مالی سال کے لئے منظور کردہ 727 ارب روپے کے "پی ایس ڈی پی" کے بجٹ میں 258 ارب روپے کی کمی کر دی جائے گی، جس کے بعد اس کی مالیت 469 ارب روپے رہ جائے گی۔ ذرائع کے مطابق وزارت منصوبہ بندی اب پی ایس ڈی پی کی 727 ارب روپے کی مجموعی مالیت میں کم سے کم 87 ارب روپے کا اضافہ کروانا چاہتی ہے۔ یہ وہ رقم ہے، جو پارلیمنٹیرینز کو ان کی ترقیاتی اسکیموں کے لئے دی گئی ہے۔ وزارت منصوبہ بندی کی یہ سفارش ملک کے موجودہ مالی حالات کے علاوہ عالمی مالیاتی اداروں کے مطالبات کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی، جو حکومت پر مسلسل زور دے رہے ہیں کہ ترقیاتی بجٹ میں کٹوتی کی جائے، تاکہ ضروری اخراجات کے لئے رقوم کی دستیابی ممکن ہو سکے۔ وزارت منصوبہ بندی بہ ذات خود کوئی وجود نہیں رکھتی، کسی زمہ دار نے ہی ایسی سمری تیار کی ہوگی اور اس پر دستخط کئے ہوں گے۔ اسی افسر یا عہدے دار کو فوری طور پر گرفتار کر کے ملکی مفادات سے کھلواڑ کرنے اور لوٹ کھسوٹ کی راہ ہموار کرنے کے جرم میں کڑی سزا دے کر نشان عبرت بنا دیا جائے۔

## سائیں سرکار کے خزانے پر کاری وار

سائیں سرکار کی حکومت میں کون سا ایسا شعبہ ہے، جو خورد برد اور لوٹ کھسوٹ سے بچا ہو، گزشتہ دنوں سیلاب متاثرین کی بحالی کے لئے مختص رقوم اور امدادی سامان میں بڑے پیمانے پر گھپلوں کی رپورٹس وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں، اب آڈیٹر جنرل کی کووڈ 19 سے متعلق اخراجات کی آڈٹ رپورٹ سامنے آئی ہے، جس نے مزید بے قاعدگیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق 15 کروڑ 32 لاکھ روپے کی غیر معیاری پی سی آر مشینیں، پی سی آر کٹس اور ہینڈ سینی ٹائزر خریدے گئے۔ ان میں پی سی آر کٹس اور ہینڈ سینی ٹائزر غیر معیاری تھے۔ رپورٹ کے مطابق 50 کروڑ روپے مالیت کی پی سی آر کٹس محکمہ صحت کو فراہم کی گئیں۔ اسپتال انتظامیہ نے پی سی آر کٹس غیر معیاری ہونے پر واپس کر دیں۔ ان کٹس اور مشینوں کو سول اسپتال، جناح اسپتال و دیگر سرکاری اسپتالوں نے واپس کیا، تاہم نجی یونیورسٹی سے کٹس اور مشینیں واپس نہیں آئیں۔ رپورٹ کے مطابق آئی سی یو وینٹی لیٹرز مہنگے داموں 21 کروڑ 68 لاکھ روپے میں خریدے گئے، اس کے علاوہ 22 کروڑ 23 لاکھ روپے کی غیر تصدیق شدہ نان میڈیکل اشیاء ▯ خریدی گئیں۔ آڈیٹر جنرل کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ پی ڈی ایم اے نے ساڑھے 86 کروڑ روپے کی مختلف اشیاء ▯ خریدیں، خریدی گئی ان اشیاء ▯ کی کورونا میں ضرورت نہیں تھی۔ سائیں سرکار کی لوٹ کھسوٹ کی ایسی بے شمار رپورٹیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں، مگر لوٹ مار کا سلسلہ کسی صورت تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ اس سلسلے کو روکنے کے لئے بے رحمانہ اور شفاف احتساب اور سخت ترین سزائیں بے حد ضروری ہیں۔

## نیب کی موت، احتساب کیسے ہوگا؟

دنیا نے کرپشن کے خلاف عالمی کنونشن 2003 میں جاری کیا، مگر حیران کن، بلکہ دل خوش کن بات یہ ہے کہ پاکستان میں کرپشن کے خلاف 1947 سے موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح انتہائی زیرک اور دور اندیش انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد 1947 میں ہی کرپشن کے خلاف قانون بنا دیا تھا، مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بیوروکریسی اور حکمران طبقے کے گٹھ جوڑ کے باعث کسی بھی حکومتی یا سرکاری شخصیت کا احتساب نہ ہو سکا اور نہ آج تک کسی کو عبرت ناک سزا ملی۔ اگر احتساب کے قانون پر اخلاص، مکمل شفافیت اور دیانت داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جاتا اور وطن عزیز میں حکومت میں شامل افراد اور سرکاری اداروں میں مختلف عہدوں پر تعینات افسران و اہلکاروں کی جانب سے اپنی حیثیت اور عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے چوری، لوٹ مار، غبن کرنے والوں کو نشان عبرت بنا دیا جاتا تو شاید پاکستان سے کرپشن کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ احتساب کا قانون مختلف تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تاہم لوٹ مار اور کرپشن میں ملوث افراد کے احتساب اور ان سے لوٹے گئے "مال" کی ریکوری کے لئے اس قانون کو نیشنل اکاؤنٹی بیلیٹی بیورو (نیب) کا نام دیا گیا، مگر عام طور پر حکومت سے باہر سیاسی افراد کی جانب سے اس ادارے کو تنقید کا نشانہ ہی بنایا جاتا رہا ہے اور ادارے کی غیر جانب داری پر شکوک و شبہات کا اظہار ہی کیا جاتا رہا ہے، تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ نیب کی جانب سے احتساب عدالتوں میں پیش کئے گئے مقدمات میں کرپشن میں ملوث کسی ایک شخص کو بھی سزا نہیں ملی۔ یعنی احتساب کے لئے قائم کیا گیا یہ ادارہ کرپٹ لوگوں کا احتساب کرنے میں یکسر ناکام رہا ہے۔

جنرل مشرف کے دور میں نیب میں "پلی بارگین" کی بے ہودہ شق شامل کی گئی، جس کے تحت وطن عزیز کے غریب عوام کے لوٹے گئے مال و دولت کا مخصوص حصہ ادا کر کے "ڈرائی کلین" ہو کر بندہ سزا سے بچ جاتا ہے، تاہم وہ کسی بھی سرکاری عہدے کے لئے نااہل ہو جاتا ہے۔ نیب کی اس حد تک پہنچ اور طاقت سے سب سے زیادہ ن لیگ اور پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما براہ راست متاثر ہو رہے تھے، چنانچہ بھان متی کے کنبے کے مصداق 13 جماعتوں کے اتحاد پر مشتمل موجودہ شہباز حکومت نے آتے ہی سب سے پہلے نیب کے اختیار، دائرہ کار اور کارکردگی کو کم کرنے کے لئے فوری طور پر ایسی ترامیم کر دیں، جن کے بعد گویا نیب کی موت واقع ہو گئی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ اگر 50 کروڑ سے اوپر رقم لوٹی گئی ہو تو کیس نیب کے دائرہ اختیار میں آ سکے گا۔ یعنی برسر اقتدار ٹولے کا کوئی فرد یا کوئی سرکاری عہدے دار اگر 49 کروڑ تک کی بھی کرپشن کرتا ہے تو یہ سمجھا جانا چاہیے کہ اسے پکڑا نہیں جا سکے گا، نہ اس پر کیس بنایا جا سکے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حکمران ٹولے میں زیادہ تر افراد پر نیب کیسز ہیں، چنانچہ اس بات میں کوئی شک شبہ نہیں کہ موجودہ حکمرانوں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے نیب قوانین میں ترامیم کر کے اسے بالکل لولا لنگڑا، بلکہ معذور بنا کر رکھ دیا۔ وطن عزیز میں بسنے والے 24 کروڑ عوام حکومت سے یہ پوچھنے

میں حق بہ جانب ہیں کہ کیا اس ملک اور اس میں بسنے والوں کا یہی نصیب ہے کہ جو لوگ ان پر حکومت کرنے آئیں، وہ جو چاہیں اور جتنی چاہیں، لوٹ مار کریں، مگر انھیں روکنے ٹوکنے اور پکڑنے والا کوئی نہ ہو؟ کیا کوئی شخص یا گروہ کسی بھی ملک کا حکمران اس لئے بنتا ہے کہ وہ بے دریغ اور بے رحمی سے لوٹ مار کر کے اپنی جیبیں اور اپنے بینک اکاؤنٹ بھرتا رہے اور عوام دو وقت کی روٹی کو بھی ترستے رہ جائیں؟ پوری دنیا میں ایسا کون سا ملک ہے، جہاں کے سیاست دان اور حکمران مال دار اور عوام انتہائی غربت اور فاقہ کشی کا شکار ہوں؟

ذاتی مفادات کے حصول، اپنے آپ کو مقدمات سے بالکل پاک صاف کرنے، آزادانہ لوٹ مار کرنے اور پکڑائی سے محفوظ رہنے کے لئے نیب زدہ موجودہ حکومت نے نیب قوانین میں جو ناجائز اور غیر قانونی ترامیم کیں، اس کے خلاف تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے سپریم کورٹ میں کیس بھی دائر کر رکھا ہے، جس کی سماعت تادم تحریر جاری ہے۔ سماعت کے موقع پر سپریم کورٹ نے بھی قرار دیا کہ عمران خان پارلیمنٹ سے نہ جاتے تو نیب قانون میں خامیوں کی نشان دہی ہوتی۔ بنچ کے رکن جسٹس منصور علی شاہ نے سماعت کے موقع پر استفسار کیا کہ کیا عدالت بین الاقوامی کنونشنز کے مطابق قانون سازی کی ہدایت کر سکتی ہے؟ اگر عدالت ہدایات دے بھی تو پارلیمان کس حد تک ان کی پابند ہو گی؟ اس کے جواب میں عمران خان کے وکیل خواجہ حارث کا کہنا تھا کہ عدالت کئی مقدمات میں پارلیمان کو ہدایات جاری کر چکی ہے اور کئی قوانین کی تشریح بین الاقوامی کنونشنز کے تناظر میں کی ہے۔ اس کے جواب میں چیف جسٹس کا اپنے ریمارکس میں کہنا تھا کہ عالمی کنونشنز میں نجی افراد کی کرپشن کا بھی شخصی تذکرہ ہے۔ نجی شخصیات میں کنسلٹنٹ، سپلائر اور ٹھیکے دار بھی ہو سکتے ہیں۔ نجی افراد اور کمپنیاں حکومت کو غلط رپورٹ بھی دے سکتی ہیں۔

درحقیقت جنسی ہراسگی سمیت ہمارے کئی قوانین میں خامیاں موجود ہیں، اسی لئے جسٹس منصور علی شاہ نے سماعت کے موقع پر خواجہ حارث ایڈووکیٹ سے یہ سوال کیا کہ کیا کوئی کنونشن مقامی قانون میں موجود خامیوں کو دور کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ کیا کنونشن کے قوانین مقامی قانون میں شامل تھے؟ لیکن ترامیم کے ذریعے انھیں ڈی ٹریک کر دیا گیا؟ کیا ترامیم سے پہلے احتساب کا قانون کنونشن سے مکمل مطابقت رکھتا تھا؟ سپریم کورٹ کے سوالات اپنی جگہ، مگر یہ بات اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ اب احتساب کا قانون ایک بہت ہی کمزور قانون ہے۔ اس طرح دنیا میں پاکستان کے شفاف احتساب کی ساکھ نہیں رہے گی۔ دراصل نیب قوانین میں ترامیم کے ذریعے جرائم کو ختم کر دیا گیا۔ محض اپنے بچاؤ کے لئے ترامیم کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا گیا کہ کوئی سیاسی جماعت غلط قانون بنائے تو عوام اسے ووٹ نہیں دیں گے۔ جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کے احتساب کا یہی طریقہ بتایا دیا گیا ہے۔ تاہم دوسری حکومت آ کر موجودہ ترامیم ختم کر کے قانون تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مالیاتی پالیسی میں معاشی بہتری کے نام پر پارلیمان قانون نرم کرے تو عدالت کیا کر سکتی ہے؟ نیب میں کی گئی موجودہ ترامیم پر اگر پارلیمان میں بحث ہوتی تو شاید خامیوں کی نشان دہی ہو جاتی، مگر موجودہ حکومت کو خامیوں سے کیا سروکار؟ موجودہ حکمران ٹولے کا تو مقصد ہی اپنے آپ کو نیب کے شکنجے سے آزاد کروا کے "ڈرائی کلین" کی چٹ لینا تھا، چنانچہ نیب قانون ایسا بنا دیا گیا ہے کہ جرم ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔

احتساب کے لئے بنایا گیا نیب قانون اپنی جگہ ایک بہترین قانون ہے اور خرابی قانون میں نہیں، بلکہ اس کے غلط استعمال پر ہے۔ لوٹ مار اور کرپشن کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ کرپشن سے سختی سے نمٹنا چاہئے۔ کیونکہ کرپشن ایک بیماری ہے، اس سے نہ صرف معیشت متاثر ہوتی ہے، بلکہ ملک تباہ ہو جاتا ہے، لہٰذا احتساب آئینی حکمرانی کے لئے لازم ہے

موجودہ حکومت نے تو اپنے تحفظ اور مفادات کے حصول کے لئے نیب قوانین میں ترامیم تو کر دی ہیں، مگر ان من مانی ترامیم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نیب ترامیم عوام اور منتخب نمائندوں کے مابین سماجی معاہدے اور آئین کے خلاف ہیں۔ موجودہ قوانین کے تحت عوامی عہدے دار بطور ٹرسٹی احتساب سے نکل جائیں گے، جبکہ کرپشن کے ناقابل احتساب ہونے سے عوام کے بنیادی حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں۔ دراصل نیب ترامیم سے ٹرائل اتنا مشکل بنا دیا گیا ہے کہ کرپشن ثابت نہیں ہو سکتی۔ پاکستانی عوام کے ساتھ اتنا بڑا ہاتھ کر دیا گیا، مگر سوائے پی ٹی آئی یا عمران خان کے کسی کو نہ اس کا احساس ہے، نہ فکر کہ اب حکمران ٹولے یا مختلف عہدوں پر فائز سرکاری ملازمین و افسران کتنی بھی کرپشن کر لیں، انھیں پکڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ کیونکہ ترامیم کے بعد تمام نیب کیسز احتساب عدالتوں کو بھیجے گئے تو کئی افراد تمام الزامات سے بری ہو گئے۔ ان میں موجودہ وزیر خزانہ اسحاق ڈار، المعروف اسحاق ڈالر پیش پیش ہیں، جن کی نیب کیسز کی وجہ سے کچھ ہی عرصہ قبل ملک سے لوٹی گئی دولت کی وجہ سے جائداد بھی نیلام ہونے جا رہی تھی، مگر اسی شخص کو نہایت عزت و احترام سے لا کر وطن عزیز کے خزانے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا، جیسے اسے دعوت دی جا رہی ہو کہ بچہ! لوٹ، جتنا لوٹ سکتا ہے، کوئی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا!

## ڈاکوؤں کو لوٹ مار کرنے دیں، ایڈیشنل آئی جی کا مشورہ

گزشتہ دنوں 21 سالہ جواں سال طالب علم کو لوٹ مار کے دوران مزاحمت کرنے پر ڈاکوؤں نے بے رحمی سے قتل کر دیا۔ ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کے بعد ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے کراچی پولیس کے سربراہ ایڈیشنل انسپکٹر جنرل جاوید عالم اوڈھو نے کراچی کے شہریوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ براہ مہربانی ڈاکوؤں سے مزاحمت نہ کریں۔ یعنی ایڈیشنل آئی جی صاحب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "معزز ڈاکو" جب آپ کو لوٹنے آئیں تو بلا چون و چرا، عزت کے ساتھ اپنا موبائل فون اور پیسے وغیرہ ان کے حوالے کر دیں، بلاوجہ ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہوئے مزاحمت کر کے اپنی جان نہ گنوائیں۔ باقی رہی پولیس، تو وہ کیا ہر موڑ، ہر گلی کوچے اور سڑکوں پر موجود رہے گی کہ ڈاکو شہریوں کو لوٹنے آئیں تو وہ انھیں فوراً گرفتار کر لے؟ ایسا ہونا تو ممکن نہیں ہے، پولیس کو اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اب کیا پولیس سارے کام چھوڑ کر شہریوں کو ڈاکوؤں سے بچانے میں ہی لگی رہے گی؟ پھر تھانے کی حدود میں آنے والے پورے علاقے سے بھتہ کون لے گا؟ علاقے میں منشیات، جوا، سٹہ، ماوا، جسم فروشی وغیرہ اور دیگر جرائم کی سرپرستی کون کرے گا؟ فٹ پاتھ مافیا اور ٹھیلہ مافیا کے سر پر دست شفقت کون رکھے گا؟ ایڈیشنل آئی جی صاحب نہایت زیرک اور باخبر افسر ہیں، انہوں نے شہریوں کو ڈاکوؤں سے مزاحمت نہ کرنے کا مشورہ پولیس والوں کی مندرجہ بالا "مصروفیات" کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی دیا ہے۔ لہٰذا تمام شہری اس قیمتی مشورے کو اپنے پلو سے باندھ لیں اور جب بھی ڈاکوؤں سے سامنا ہو، نہایت شرافت اور عزت و احترام کے ساتھ اپنا مال و متاع ان کے حوالے کر دیں۔

# امیر ممالک کی گلوبل وارننگ کی قیمت پاکستان ادا کر رہا ہے۔شیریں رحمٰن

## امیر ممالک کا گلوبل وارننگ میں 80 فیصد حصہ ہے جبکہ پاکستان کا ایک فیصد سے بھی کم ہے تو ہم اس کی قیمت کیوں ادا کر رہے ہیں

## اندرون سندھ سیلاب سنچری بریکنگ ہے۔سترہ سو ملی میٹر بارش صرف نوشہرو فیروز میں ہوئی جہاں بارش ہوتی ہی نہیں

## سیلاب سے 80 فیصد سندھ متاثر ہوا۔وفاقی وزیر موسمیات وتبدیلی کا ہیومن رائٹس پوسٹ کو انٹرویو

اانٹرویو: ملک منور حسین ،فوٹو گرافر: دلشاد غوری

وفاقی وزیر موسمیات وتبدیلی اور پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی رہنما سینیٹر شیریں رحمان کسی تعارف کی محتاج نہیں۔عالمی وعلاقائی امور پر آپ کی گہری نظر ہے ،آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف مخالفین بھی کرتے ہیں۔آپ کا شمار نہ صرف پیپلز پارٹی بلکہ تمام سیاسی جماعتوں کی صف اول کی لیڈر شپ میں کیا جاتا ہے۔آپ سابقہ ادوار میں وفاقی وزیر اطلاعات،صحت اور امریکا میں پاکستان کی سفیر بھی رہی ہیں۔آپ نے کئی ادوار سیاست کے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔گزشتہ روز ملکی موجودہ صورتحال موسمیاتی تبدیلی سیلاب اور سیاسی گرما گرمی کے حوالے سے ایک نشست ہوئی جس کا احوال روزنامہ رفتار اور ہفت روزہ جیت میگزین کے قارئین کے لئے پیش خدمت ہے۔

شیریں رحمان کا کہنا ہے کہ عمران خان کو قوم سے جھوٹ بولنے پر معافی مانگنی چاہیے ،ایک جھوٹے بیانیہ کا سہارا لے کر ملک کی خارجہ پالیسی اور معیشت کو تباہ کر دیا سیلاب کی تباہ کاریوں کی وجہ سے عوام مشکلات کا شکار ہے مگر عمران خان کو اقتدار جانے کا غم ستائے جا رہا ہے۔اقتدار آنی جانی چیز ہے وہ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔

سوال: آپ یہ بتائیے کہ موسمیاتی تبدیلی سے سب سے زیادہ پاکستان متاثر ہوا ہے نقصانات اور متاثرہ علاقوں کی بحالی بارے میں کچھ بتائیں؟

شیریں رحمان: پاکستان پیپلز پارٹی کی ترجیح عوام کی فلاح اور ریلیف ہے اور اس تخلیق کو پہنچانے میں 20 ہفتے لگنے ہیں اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ پاکستان کی زندہ تاریخ میں یہ ایک جیتی جاگتی مثال ہے اندرون سندھ میں اب بھی لوگ تکلیف میں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہر جگہ یورپ میں بھی کاسٹ آف لیون 40 فیصد بڑھ چکا ہے۔یہی اعداد وشمار آئے ہیں تو دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک انتہائی مشکل کی گھڑی ہے اور امتحان کا مرحلہ ہے۔پاکستان میں تو اس کے شاخسانے ہمارے گھروں میں محسوس اور دیکھے جاتے ہیں جو لوگ فلڈ سے متاثر ہیں ان کا ہمیں سب سے پہلے خیال رکھنا چاہیے۔اندرون سندھ سیلاب سے اس ریلے سے سنچری بریکنگ ہے ،یہ پورے سنچری کا فیوگن ہے ،ایکصدی کی ریکارڈ موسمیاتی تبدیلی ہے جس میں 33 ملین لوگ متاثر ہوئے ،آپ بتائیں کہ اس سے زیادہ لوگ جب متاثر ہوتے ہیں تو جو تین یورپین ممالک کے برابر ہوتا ہے۔یہ رقبہ یہ لوگوں کی تعداد تو آپ سوچیں کہ ویسے ہی ایک قرضوں میں گھری ہوئی حکومت کس طرح ان کی ضروریات پوری کر سکے اور یہ سب ضروریات اسی وقت پوری کرنی ہوتی ہیں۔دیکھیں صاف پانی کھانا اور چھت یہ بیسک ضروریات ہیں اور ٹینٹ میں لوگ اب بھی سردیوں کا سیزن گزاریں گے۔پریشانی تو یہ ہے کہ ایسا ہوگا کیونکہ بیس اعشاریہ چھ ملین لوگ ابھی بھی 33 کے بعد جو متاثر ہوئے ہیں بہت سے لوگ سروس بھی ہوئے ہیں بہت سے لوگوں کو ٹینٹ دیئے بھی کیے ہیں اور اتنے سارے ٹینٹ مینوفیکچر کرنے میں اور دوسرے ممالک سے لینے میں وہ بھی مینوفیکچر کر رہے ہیں اور 32 ممالک کی ڈیزاسٹر مینجمنٹ ٹیم ابھی واپس گئی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان کو بیسٹ چیزیں بھی مل جائے پھر بھی ان کی آگے کی زندگی ان کا ذریعہ معاش ان کے بچوں کا اسکول یہ سب چیزیں بھی تو ہیں اور یہ صرف ایکمسئلہ نہیں ہے۔یہ ان کی آنکھوں میں سوال ہے کہ ہم آگے جا کر کیا کریں گے کہ ہمارا لائیواسٹاک چلا گیا۔کھیت کھلیان ختم ہونا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ہمارے اعداد وشمار کچھ اس سے زیادہ ہیں تو یہ تخمینہ نقصانات اور گھروں کے گرنیکے بھی ہیں تو یہ تخمینہ لگائے جا رہے ہیں،مستقل مجازی سے ایک فائنل نیڈ ریسیسمنٹ ہوگا ابھی جو تین ایک دن میں نکلنے والا ہے جس میں سارے بزنس ڈیولپمنٹ اور ورلڈ بینک اور سب متحرک ہیں۔اس میں آر ڈبلیو اور تنظیمی ریاست کی سارے ادارے اس میں متحرک ہیں اور سب تیار کیا جا رہا ہے چودہ سو ہیلتھ فیسلٹیز جو ہے وہ ڈیمیج ہوئی ہیں 8.2 ملین لوگوں کو میڈیکل ریٹینشن کی ضرورت ہے جو ہمیں ڈبلیو ایچ او نے بتایا اور وہ بھی وہاں پر متحرک ہیں۔لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس 8.2 میں جو ہیں وہ چار فیصد حاملہ عورتیں بھی ہیں،کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کو سینٹری کنڈیشن تک پہنچایا جائے۔ پاکستان کی تاریخ میں پاکستان نیوی کو کبھی اندرون سندھ میں کام نہیں کرتے دیکھا۔نیوی اور ایئر فورس ان کے جہاز اڑتے سب نے دیکھے ہیں۔ ہم نے ہیلتھ ایڈمنسٹریشن میں ہیلتھ طور پر استعمال

کرنا پڑ رہا ہے۔ ابھی تک جو پورا علاقہ متاثر ہوا ہے یہ جس میں 13 ہزار سے زیادہ آپ کے ہائی ویز اور روڈز نکال دیے ہیں جیسے اکھاڑ کر نکال دیا ہو۔ 438 پل جو کہ خاص طور پر نارتھ کی طرف سے ریلا آتا تھا اور تنکے بھی بہا کر لے جاتا تھا جو وہاں سے آتا تھا گلیشیئر لیگ سے ووٹنگ کی طرح بر جس کو نکلتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بڑے بڑے برج کو تو لوس اینڈ ڈیمج جو ہم استعمال کرتے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلی میں جو سروسز میں استعمال کرتے ہیں جو پاکستان کے ایجنڈا میں اس کی سخت ڈپلومیسی رہی ہے اور چیئرمین بلاول بھٹو کی بھی اور پرائم منسٹر کی بھی، یو این ایمیں لوس اینڈ ڈیمج کا سبجیکٹ اب کم از کم پروڑہ ایجنڈا پر آ رہا ہے۔ پہلے نہیں آیا تھا کبھی بہت سارے ممالک نے اس پر بحث بھی کی تھی اور بہت آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جی ٹوئنٹی وغیرہ ممالک کو لیکن نہیں ہوا پچھلی میں بھی نہیں ہوا اور ایسا لگ رہا تھا کہ نہیں ہوگا اس دفعہ ایک سپر ویڑ را ایجنڈا پر آ گیا ہے کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کلائمنٹ کی تباہ کاریاں جو 2022 یہ جو جنگ ساری مخلوق نے لڑی ہے یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے اور یہ یو این



سیکریٹری جنرل نے بھی کہا ہے کہ کلائمنٹ چینج ڈیزاسٹر نیچر فائٹنگ بیک کیوں کہ اس کا نظام بدل گیا ہے، اس کے ویدر کا اس کی ہر چیز کا تو آپ وہ اس طرح کرتے جائیں گے پاکستان گلوبل گرین ہاؤس گیسز ہوتی ہیں، میں جانتی ہوں کے یہ سب سائنٹیفک باتیں ہیں، گلوبل وارننگ گرمائش جو آتی جارہی ہے ماحول میں وہ اسی فیصد سے زیادہ امیر ممالک نے کی ہیں اور پاکستان جیسے ملک کا تو آپ سب نے سن لیا ہوگا کہ ون پرسنٹ سے کم ہے۔ ہمارا پورے گلوبل میں حصہ تو ہم اس کی قیمت کیوں ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے بچے، ہماری عورتیں 70 فیصد ایفیکٹ پاپولیشن متاثرین میں سے عورتیں اور بچے ہیں سترا ہزار لوگ لقمہ اجل ہوئے ہیں تو آپ یہ بتائیں یہ قیمت پاکستان ادا کر رہا ہے تو کہ یہ مقدمہ لڑنے کا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے انٹرنیشنلی تو بہت مضبوط طریقے سے اس مرتبہ تو پرائم منسٹر کی تقریر بھی آپ نے دیکھی ہوگی تو بہت شور سے کی ہے۔ یو این اے میں اور اس کے بعد وزیر خارجہ ہر جگہ یہ بات کر رہے ہیں اور بہت مضبوط طریقے سے دلائل پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے گونج ہے ساری دنیا میں لیکن یہی ہم کہہ رہے ہیں کہ ملک کے اندر ہم جو کر سکتے ہیں ہمیں جو عرب ٹیشن کے کام ہوتے ہیں جو پلینٹگ کے کام ہوتے ہیں جو واٹر ڈیمیج کے کام ہوتے ہیں گھر نہ بنائے راستہ نہ بنائیں آبادی نہ پھیلائیں تا کہ اگلی دفعہ لوگ اس طرح متاثر نہ ہو۔ ڈیتھ آف انجریز نا پائی جائیں انجریز جو بہت زیادہ ہوئی ہے بارہ ہزار سے 13 ہزار لوگ اس میں زخمی بھی ہوئے ہیں۔ وفاق اور سندھ حکومت بہت کلوزلی کام کر رہی ہے دوسری حکومتوں کے ساتھ بھی ایک ہی طریقہ کار ہے کوئی تفریق نہیں ہے وہ جو چاہیں گے وہ جو چاہے حصہ دار بننا چاہیں وفاق کا کام ہوتا ہے ہر ٹائپ کو برابری کے بنیاد پر ٹریٹ کریں جو پچھلی حکومت کرتی تھی وہ ہمارا طریقہ کار بالکل نہیں ہے کیونکہ ساری باتیں سب کے سامنے آتی ہیں اور پھر آپ ذمہ دارانہ طریقے سے کام اور اس وقت جو لوگ مشکل میں ہیں ہم تو سمجھتے ہیں کہ تقسیم کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے سے لوگوں کو یہ پیغام ملتا ہے کہ ہم اپنی سیاست میں اپنی اپنی انا اپنی اپنی ذات کو چمکانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں اور جو لوگوں کے مسائل ہیں اس پر فوکس نہیں کرتے اور یقین مانئے کہ کئی دن پوری نیند رات کی مکمل نہیں سو پاتے کوئی نہ کوئی ایگریکلچر میٹنگ ہو رہی ہے۔

باہر سے لوگ بہت امداد دینے آئے ہیں اور سول سوسائٹی پاکستان نے بھی بہت کام کیا ہے۔ تھوڑا ریلیف ورلڈ بینک کر رہا ہے آپس میں بھی ہمارے سارے مطلب کے پرائیویٹ فنڈ جو ہیں وہ ہم خود دیکھیں 107 ملین ڈالرز فوری طور پر وہ کنورٹ ہو گئے۔ ڈی آئی این ڈی کے لئے تا کہ جو ستر ملین پہلے سے آخری تک جانے ہیں پچیس پچیس ہزار متاثرہ گھرانوں کو وہ ان کو مل جائے گا

سوال: بینظیر انکم اسپورٹ پروگرام سے کس حد تک لوگوں کی امداد کی گئی ہے اور بارشوں کے بارے میں کیا اپ ڈیٹ رہیں محکمہ موسمیات کی کارکردگی بارے کیا کہیں گی؟

شیری رحمان: ہمارے پاس اگر بے نظیر انکم سپورٹ نہیں ہوتا تو ہم کہاں سے وہ پرویڈنگ ان ٹیکسٹنگ ایریاز سے کہا سے کرتے لیکن دنیا مان گئی کہ یہ ٹرانسپیر نٹ ریلائبل سسٹم ہے سیلاب کے حوالے سے اعداد و شمار اور آگے جو ڈیولپمنٹس ہیں کیونکہ ہمارے لئے سیلابی جو افراد ہیں چاہے وہ بلوچستان میں ہوں سندھ میں یا خیبر پختونخوا میں بھی کچھ لوگ ہیں پنجاب میں بھی دو تین اضلاع ہیں وہ ساؤتھ میں اے وی کے نے کل آ کے کہا ہے کہ کلائمٹی یا ڈسٹرک تھوڑی سی ہیں اس بار تاریخ میں پہلی بار ان کے یہاں مائنس بارش ہوئی تھی نارملی آپ دیکھتے ہیں کہ فلڈ وہاں سے آتا ہے اور گلگت بلتستان میں تو آپ نے تباہ کاریاں دیکھی ہیں تو سب سے زیادہ میں دو ٹوک الفاظ میں کہوں گی ہمارے سارے اعداد و شمار 80 فیصد سندھ متاثر ہوا ہے جیسے آپ نے دیکھا کہ سترہ سو ملی لیٹر نوشہرو فیروز جیسے شہر میں ہو جس نے کبھی بارش نہ دیکھی ہو مجھے یہ اس لیے پتہ ہے کہ وہاں پر ہمارا وہاں سب سے پرانا میٹ اسٹیشن ہے، انہوں نے تو یہ پہلے ہی ڈسٹرکٹ کی تھی کہ ہمیں کبھی تاریخ تیس سال پہلے کہتے تھے ایوریج میں کہ ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ سندھ اینڈ کراچی میں انڈر 100 ملی لیٹر کراچی اینڈ پٹیلر نمبر ون نمبر ٹو تھے اس کے بعد دوسرے علاقے آتے تھے اور دیکھیں جب ریلا آ گیا تو وہ پھر اندر جاتے ہیں جو دادو ہو گیا پھر جو ہی ہوا پھر آپ نے دیکھ لیا۔ اندرون سندھ کی میری نظر میں آئی ہوپ آئی ایم رونگ پروگریس ہی بدل گئی ہے اس کی شکل ہی بدل گئی ہے اس کی سوئے اسکی واٹر بہت بڑی چین بن گئی ہے جو ایسی جھیل نہیں ہے جس پر بیٹھ کر آپ انجوائے کریں گے وہ ایسی چیز ہے جو نیچرل ہے جو لوگ کے ولیجز کے اوپر بنی ہوئی ہے اور یہ ایک اسٹیج واٹر ہے اس کو نکالتے نکالتے پتا نہیں کیا ہوگا۔

سوال: سیاسی ماحول میں بڑی گرما گرمی ہے عمران خان حکومت کو ٹف ٹائم دینے کے لئے اسلام آباد رخ کر رہے ہیں، لانگ مارچ کی بھرپور تیاری اس بارے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

شیریں رحمان: میں بدتمیزیوں سے تو ویسے ہی گریز

کرتی ہوں لیکن وہ کہاں گیا سونامی لوگوں کا 12 سو لوگ تو فیض آباد انٹرچینج پر لا نہیں سکے، کہا کہ سیلاب کی وجہ سے ہم منسوخ کرتے ہیں، ہم نے بھی لانگ مارچ کی مگر ہم نے کبھی خون خرابے کی اناؤنسمینٹ نہیں کی۔ بلاول بھٹو زرداری کے لانگ

مارچ میں ساتھ تھے ایک بھی گملا نہیں ٹوٹا اور جب قافلہ پنجاب سے نکلا اور صوبے جوائن کر رہے تھے جب بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اینیشل سیکنڈ صوبہ پنجاب تھا سندھ کے بعد جب زیادہ بڑھنے لگا میں دس دن اس ٹرک پر تھی دھوپ میں چھاؤں میں رات میں ہم سب تھے اس وقت جہاں جہاں چیئرمین بلاول کے کارکن تھے وہاں ہم خود تھے اس میں خود کھڑے ہو کر چیئرمین بلاول بھٹو نے مائک پر کہا کہ مجھے پتا ہے کہ یہ میلوں کا ہوتے جا رہا ہے تو لوگ بے ساختہ ہو کر دوسری لائن میں ہائی وے پر نکل آتے ہیں۔ یہ نہ کریں پی ٹی آئی نے اناؤنسمنٹ کیا ڈنڈے لے کر آئیں گے دیکھ لیں گے تو بھائی ہم کیا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے دارالخلافہ کو جلنے دیں گے تو پھر آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ آپ لوگ کیا ہیں بھائی آپ بھوت سرکار ہے یا سرکار ہیں۔ ظاہری بات ہے اسکا تو ردعمل ہوگا آپ نے چار سال 144 لگا کر ملک چلایا ہے تھوڑا حوصلہ رکھیں نہ ہم بھی تو کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہوا پاکستان پیپلز پارٹی ریونج کی سیاست میں یقین نہیں رکھتی، لیکن باقی لوگ تو پوچھتے ہیں نہ سب سے زیادہ نیوز بیک عمران خان نے کیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میرے خلاف نیوز فیک آئی ہیں جتنا انہوں نے نیوز فیک کی یہ ہیں ان کا شرم سے سر جھکا جانا چاہیے اور ان کی جماعت کا بھی ہمارے ساتھ کبھی ایسی چیز ہوتی تو ہم آپ کے سامنے سے بھاگ رہے ہوتے آپ خود سوچیں انہوں نے بیرون ملک سازش کی بات کیوں کی کیونکہ انہوں نے یہی ہوا خود یہ ٹیلی لگا کے ملک کو چلانے کی سوچیں اور سمجھیں مرضی کے منٹس بنائیں گے اور پھر جو مرضی آئے آپ عوام کو بتائیں گے اور پھر چاہے آپ کی خارجہ پالیسی جلے ملک جلے پورے میں آپ کی اقتصادی پالیسی جلے تو پھر آئی ایم ایف کو بھی ایک لیٹر ڈالو کہ وہ نہ رجوع کریں اور وہ یاد ہے آپ کو اور اس کی تکلیف کس کو ہوتی نہ صرف ملک اور ریاست کو بلکہ عوام کو لیکن وہ سب کو سیکٹری فائز کرنے ہیں۔ اپنی آنا کے لیے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی قانون سے بالا ہیں اکثر لوگوں کے

دماغ میں یہ میسج ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی بھی قانون سے بالا ہے لیکن وہ مستقل ایک الیکشن کمیشن کو دباؤ میں رکھتے ہیں وہ گالی گلوچ حملہ دھمکی تو اس کی سیاست کرتے ہیں اب الیکشن کمیشن نے وہ کیا جو وہ بہتر سمجھتے ہیں اگر کسی اور جماعت نے چیرٹی کے نام پر کرکٹ میچز کھیلے ہوتے جو رفیع صاحب کے ذریعے انہوں نے کیا اور وہ پیسے غائب ہوتے تو لٹکے ہوئے ہوتے سارے کے سارے ان کو تو پتہ نہیں قانون کیا ہوتا ہے اور قانون کی لمبی پہنچ کیا ہوتی ہے ابھی تو انہوں نے کچھ دیکھا نہیں ہے فارن فنڈنگ نہیں آئی اس کے اوپر اتنے سارے سوالات ہیں اتنے سارے گیپس ہیں اور دیکھیں بات کرنے کی ہے، کرپٹ پریکٹسز ڈیفائنڈ ہیں الیکشن ایکٹ میں اگر دانستہ طور پر گوشوارے چھپاؤ تو وہ 173 ہے 2017 کا الیکشن ایکٹ سیکشن ون سیونٹی تھری کے مطابق اگر آپ دانستہ طور پر اپنی ٹرانزیکشن چھپاتے ہیں تو کرپٹ پریکٹسز کی ڈیفینیشن میں آ جاتا ہے تو آپ ایک سے زائد بار کرپٹ پریکٹسز کے زمرے میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ گالم گلوچ کی ایک نئی سیاست نوجوان نسل کو متحرک کر کے شروع کر دی ان سے پوچھ لیں

ہزار لوگ تو جمع نہیں کر سکے، فیض آباد انٹرچینج پر کراچی میں نہیں ہوا پہلے تو اب کہاں ہوگا تنظیم ہوتی ہیں ایک سوچ کے پیچھے صدائے بہت دور تک جاتی ہیں میں جانتی ہوں یورپ کی تاریخ کو انہوں نے اپنی ایک نئی پھلجھڑی جلا دی ہے۔

ان کے ذہن میں تو یہی چلتا ہے کہ قانون ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا اور قانون سے اپنے آپ کو بالا سمجھتے ہیں، اقتدار آتا ہے اور جاتا ہے یہ ایک حقیقت ہے زندگی کی جیسے زندگی موت ہوتی ہے اقتدار آج ہے کل نہیں ہوگا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ میں تو ہیرو ہوں یا پھر یہ کوئی کرکٹ کا کھیل ہے اور ہم جو انتظامات کر لیں گے وہ آپ دیکھ لیں گے کوئی مطلب ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا ہوگا۔ عمران خان کو معافی مانگنی چاہیے قوم سے کہ انہوں نے جھوٹ کے بعد جھوٹ بولا ہے پاکستان کو دلدل میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے اپاکستان کی سیاست جمہوریت کو اقتدار کیلے پاکستان کی خارجہ پالیسی سمیت ساری پالیسیوں کو تباہ کاری میں لے آئے تھے لوگوں نے ہم سے بھی سوال کیے۔ وہ اپنے آپ کو خود ختم کر رہے ہیں تو آپ بیچ میں کیوں آ رہے ہیں ہم بیچ میں اس لیے آئے جہاں وہ جا رہے تھے ہمیں ایک سیکنڈ ہینڈ لینی تھی دیکھیں جب تک پاکستان ہیں تب تک ہم ہیں جب وہ ڈوبنے چلا گیا جب وہ ہر چیز اس کی ختم ہوتی چلی گئی تو پھر کون نکالے گا پاکستان کو پھر کیا فائدہ ایسی سیاست کا جو صرف اپنی ذات کے لیے ہو تو یہ رسک لینا تھا ناٹھیک ہے اور نہ ہمارا مذہب ایسی کوئی اجازت دیتا ہے سیاست کا اور ہم نے بھی کچھ غلطیاں کی ہیں ہم بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں آپ آئین اور قانون سے بالاتر ہو جو چاہو وہ کرو آپ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی سوال نہ کرے چاہے ہم ٹوٹ کے جھوٹ بولتے جائیں گے چاہے چیریٹی کے پیسے ہمارے اپنے اکاؤنٹس میں جائیں ان سے کہیں کہ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے عدالت کے فیصلے ہوتے ہیں عدالتوں پر بھی اٹیک کیا ہے انہوں نے کون سا ادارہ چھوڑا ہے جہاں پر انہوں نے اٹیک نہیں کیا جب ان کی مرضی کا فیصلہ کر دیں تو ٹھیک ہے اور جب مرضی کا فیصلہ نہیں آئے تو حملہ بول دیتے ہیں تیر برساتے ہیں جلسوں میں کھڑے ہو کر لوگوں کی ذاتی زندگی پر کبھی بم گرانے پر آ جاتے ہیں وہ ہر ادارے کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں سیاسی قیادت کے ساتھ انھوں نے جو کیا وہ آپ نے دیکھا راتوں رات لوگوں کو اٹھایا گیا خواتین کو چاندرات کو فریال تالپور کو اٹھایا گیا اسپتال سے بکتر بند گاڑی میں یاد ہے کہ نہیں تم نے جو کیا سب کے سامنے ہے کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

# ماحولیاتی تبدیلیوں سے متاثر پاکستان کی تعمیر نو اور شہری معیشت

**پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے قحط، خشک سالی اور اربن فلڈنگ جیسے کئی مسائل کا سامنا ہے۔**

**گزشتہ صدی کے اختتام اور موجودہ صدی کے آغاز سے پاکستان کو تواتر سے قدرتی آفات کا سامنا ہے**

راجہ کامران

پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے قحط، خشک سالی اور اربن فلڈنگ جیسے کئی مسائل کا سامنا ہے۔

گزشتہ صدی کے اختتام اور موجودہ صدی کے آغاز سے پاکستان کو تواتر سے قدرتی آفات کا سامنا ہے اور ان آفات کی شدت دن بہ دن بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ ان میں سے بہت سی قدرتی آفات کو ہم نے بھلا دیا، مگر بہت سی قدرتی آفات ایسی ہیں جن سے سبق سیکھ کر پاکستان نے ہنگامی حالات سے نمٹنے کی تیاری کی ہے۔ مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ ہی پاکستان کو شدید ہوتی ہوئی قدرتی آفات کا سامنا ہے۔

حالیہ دنوں پاکستان نے تاریخ کے بدترین سیلاب کا سامنا کیا اور اب ہماری ساری توجہ سیلاب متاثرین اور ان کی بحالی پر مرکوز ہے۔ مگر پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے بھی انتہائی موسمی حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جون اور جولائی میں مون سون بارشوں میں سیلاب سے متاثرہ سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں تاحال پانی بڑی مقدار میں کھڑا ہے اور سرد موسم کے آنے کے باوجود نہ صرف لوگوں کے گھروں کی تعمیر نو یا مرمت ہوسکی ہے بلکہ سردی سے بچاؤ کیلیے ان متاثرین کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں۔

سیلاب کی تباہ کاریوں اور اس سے بحالی پر بات کرنے سے قبل پڑھنے والوں کو اس سال موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے رونما ہونے والے چند انتہائی اہم واقعات کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اس سال کے آغاز پر سیاحتی مقام مری میں سیاحوں کی ہلاکت کا معاملہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا، جس میں سیاح نہ صرف جان سے گئے بلکہ جو بچ گئے ان کی حالت بھی کئی دن تک سنبھل نہ پائی۔

اس سرد ترین موسم کے بعد یہ بات سامنے آئی تھی کہ 2022 تاریخ کا گرم ترین سال ہوگا۔ اسی گرمی کی وجہ سے کراچی میں آگ لگنے کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ گرمی کی شدت صرف شہروں تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ اس نے پاکستان میں جنگلات کو بری طرح متاثر کیا۔ جنگلوں میں لگی آگ نے حالات کو مزید مخدوش بنا دیا۔ پاکستان

میں پہلے ہی جنگلات کا رقبہ بہت کم ہے مگر حالیہ گرمیوں میں جنگلات میں لگنے والی آگ نے بلوچستان کے شیرانی جنگل میں لگے چلغوزے کے درختوں کو بری طرح سے نقصان پہنچایا اور یہ آگ ایک ماہ سے زائد عرصے تک لگی رہی جس میں سیکڑوں سال پرانے درخت بھی جل کر راکھ ہوگئے، یعنی ایسی آگ لگنے کا واقعہ کم از کم دو سو سال کے بعد ہی رونما ہوا ہے۔ اس آگ سے مقامی افراد جو کہ چلغوزے کی فروخت سے روزگار کماتے تھے، کو نقصان اٹھانا پڑا۔

خیبر پختونخوا میں بھی جنگل میں آگ لگی جس نے قیمتی درختوں کو نقصان پہنچایا اور سوات میں تحریک انصاف کے بلین ٹری سونامی میں لگائے گئے درخت بھی جل گئے۔ گرمی کی شدت سے آگ لگنے کے واقعات صرف سوات اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں ہی رونما نہیں ہوئے بلکہ وفاق دارالحکومت بھی اس کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہا۔ اسلام اباد سے متصل نیشنل پارک مارگلہ ہلز پر بھی 60 سے زائد مقامات پر شدید آگ لگی جس کو بجھانے کیلیے 20 ہیلی کاپٹرز استعمال ہوئے۔

ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے پاکستان کو نہ صرف شدید بڑھتی گرمی اور شدید ہوتی سردیوں کا ہی سامنا نہیں بلکہ پاکستان، جس کے پاس دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام بھی موجود ہے، کے بعض علاقوں میں بدترین قحط کا بھی سامنا ہے۔ چولستان اور تھرپارکر میں حالیہ مون سون سے قبل قحط سالی کا سامنا تھا۔ صرف چولستان میں 1200 ایسے تالاب، جنہیں مقامی زبان میں ٹوبے کہا جاتا ہے، میں سے نوے فیصد خشک ہوئے اور تقریباً 2 لاکھ کی آبادی اپنے

20 لاکھ مویشیوں کے ساتھ بوند بوند پانی کو ترس گئی۔

یعنی اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کو ماحولیاتی

تبدیلیوں کی وجہ سے قحط، خشک سالی، شدید گرمی کی لہر، بڑھتی ہوئی سردیوں، جنگلات میں آگ، اربن فلڈنگ، کلاؤڈ برسٹ اور اس جیسے کئی مسائل کا سامنا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اب بات کرتے ہیں موجودہ سیلاب کی، جس کے اثرات سے اس وقت پوری قوم اور عالمی برادری مل کر مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن پھر بھی تاحال اس سیلاب کی آفات سے لوگوں کو نکالنے میں زیادہ امید افزا پیش رفت نہیں ہو سکی۔ سندھ اور بلوچستان کے بعض اضلاع میں تاحال پانی کھڑا ہے۔ مجھے بھی بطور رپورٹر سیلاب کی کوریج کیلیے سندھ کے علاقے سعید آباد جانے کا موقع ملا تو وہاں کے حالات دیکھ کر دل بجھ سا گیا۔ ستمبر کے مہینے میں گرمی کی شدت اس قدر تھی کہ دھوپ میں کیا، سائے میں بھی پسینہ بہہ رہا تھا۔ دریائے سندھ عبور کرتے ہوئے دیکھا کہ پانی دریا کی گنجائش سے بھی زیادہ ہے اور اردگرد کے علاقے بھی زیر آب ہیں۔

سعید آباد اور نیشنل ہائی وے کے اطراف میں واقع علاقوں میں سب سے زیادہ بری حالت کپاس کے کسانوں کی تھی۔ کپاس کی فصل تقریباً تیار تھی اور بعض علاقوں میں کپاس کی فصل کی چنائی بھی شروع ہوگئی تھی مگر مون سون بارشوں کی وجہ سے ان کی کھڑی فصلیں تباہ ہوگئیں۔ کئی کئی فٹ پانی میں کھڑے پودوں پر لگی سفید کپاس کسان کی محنت کو منہ چڑھا رہی تھی۔ حالیہ سیلاب سے پاکستان کے چاروں صوبوں میں لوگوں کو مشکلات ہوئی ہیں مگر سب سے زیادہ متاثر سندھ اور بلوچستان کے علاقوں کے وہ باسی ہیں، جن کے گھر بھی تباہ ہوئے اور ان کے علاقوں میں تاحال پانی کھڑا ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل انٹونیو گوٹیریس نے کراچی ایئرپورٹ پر صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا پاکستان کو جس تباہی کا سامنا ہے وہ پاکستان کی پیدا کردہ نہیں ہے، اس کے ذمے دار جی 20 ممالک ہیں، جو عالمی سطح پر فضائی آلودگی کا 80 فیصد پیدا کرتے ہیں۔ ان کا طرز عمل ایسا ہے جیسے انہوں نے قدرت سے جنگ چھیڑ دی ہو اور قدرت نے واپس ایک شدید حملہ پاکستان پر کیا ہے، جو اس فضائی آلودگی اور درجہ حرارت میں اضافے کا ذمے دار نہیں ہے۔ یہ جی 20 ملکوں کی ذمے داری ہے کہ وہ ماحولیاتی تباہی کا شکار پاکستان اور اس جیسے دیگر ممالک کی معاونت کریں۔ مگر ابھی تک جی 20 ملکوں نے کوئی ایسا مالیاتی نظام وضع نہیں کیا جس میں وہ ترقی پذیر ملکوں کی، جو ماحولیاتی تبدیلی سے متاثر ہوئے ہیں، معاونت کر سکیں۔ آج پاکستان ہے کل کوئی اور ملک بھی ہو سکتا ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کا مزید کہنا تھا کہ پاکستان کے قرضوں کو معاف کرنے یا پھر ان قرضوں کو پاکستان کے اندر ہی سیلاب اور ماحولیاتی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے اثرات سے بچاؤ کیلیے استعمال کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس تجویز کا بعد ازاں اقوام متحدہ کے میمو میں بھی اظہار کیا گیا کہ پاکستان کو قرضوں کی رقم اپنے ہی ملک میں ماحولیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے کیلیے انفرااسٹرکچر بنانے کیلیے فراہم کر دی جائے۔ جس پر عالمی سیاست میں کچھ ہلچل ہوئی ہے اور عالمی سیاست میں امریکا نے پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ چین سے قرضوں پر سہولت حاصل کرے جبکہ امریکا نے پاکستان کو دیے گئے 13 کروڑ 60 لاکھ ڈالر کے قرض کی واپسی موخر کر دی ہے۔

پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے کیلیے عالمی سطح پر کیا اقدامات ہو رہے ہیں اور مختلف ممالک پاکستان کی کس قدر معاونت کر رہے ہیں، وہ سب اپنی جگہ، مگر نجی شعبہ اس قدرتی آفت کے بعد متاثرین کی کوئی مدد کر سکتا ہے؟ اور کیا ایسا انفرااسٹرکچر بنایا جا سکتا ہے جس سے پاکستان کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچایا جا سکے؟ اس کا جواب انفرا ضامن کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں دیا گیا۔

سیلاب کی نوعیت کیا تھی اور کس وجہ سے تباہی ہوئی، اس بارے میں سابق بیکار اور اب زراعت کے پیشے سے وابستہ ارم ترین کھوڑو نے بتایا کہ وہ خود بھی سیلاب سے متاثر ہوئی ہیں۔ اس سال بارشیں سابقہ سیلابوں سے مختلف تھیں۔ 2012 میں 1.2 ملین کیوسک پانی پہاڑوں سے آیا تھا اور دریائے

سندھ کے اطراف میں تباہی ہوئی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ سکھر بیراج پر پیش آیا جہاں پانی کی نکاسی کی گنجائش 9 لاکھ کیوسک کی ہے اور ریلا اس سے 3 لاکھ کیوسک زائد تھا۔ اس وجہ سے سندھ ڈوب گیا۔ جبکہ حالیہ سیلاب کیرتھر اور کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں ہونے والی بارشوں سے آیا۔ پہاڑوں سے آنے والے تیز بہاؤ کے سیلاب نے ہر چیز تباہ کر دی۔ اس پانی کو سمونے کی گنجائش منچھر جھیل میں نہ تھی، جس کی وجہ سے شہر اور دیہات پانی میں ڈوب گئے۔ ارم ترین کا کہنا تھا کہ برطانوی راج میں بنائے گئے انفرااسٹرکچر میں کوئی سرمایہ کاری نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے سندھ میں بار بار سیلاب سے تباہی ہو رہی ہے۔

تو کیا پاکستان کو اسی طرح سیلاب اور موسمی تبدیلیوں کی تباہ کاریوں کے سامنے بے بسی کا مظاہرہ کرتے رہنا چاہیے یا پھر اس کا کوئی حل بھی ہے؟ اس حوالے سے اسی سیمینار سے سوین ایوین نے بھی اظہار خیال کیا جنہیں طوفانوں اور سیلاب سے بچاؤ کے انفرااسٹرکچر کی تعمیر کا 30 سال کا تجربہ ہے۔ سوین کا کہنا تھا کہ سیلاب سے بچاؤ کیلیے انفرااسٹرکچر میں سرمایہ کاری سے فائدہ ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے سوین کا کہنا تھا کہ سیلاب سے سالانہ 25 کروڑ افراد متاثر ہوتے ہیں اور معاشی نقصان تقریباً 90 ارب ڈالر ہوتا ہے۔ اور 2030 تک یہ نقصان 500 ارب ڈالر تک پہنچ سکتا ہے۔

اقوام متحدہ کے مطابق سب سے زیادہ سیلاب بھارت، بنگلہ دیش، چین، ویت نام اور پھر پاکستان میں آتے ہیں۔ یعنی سارک خطے میں سیلاب کا خطرہ سب سے زیادہ ہے۔ اور پاکستان میں بارشوں کے علاوہ دریاؤں میں طغیانی کا خطرہ بھی موجود ہے۔ جو کہ سیلاب کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں بڑے پیمانے پر گلیشیئرز موجود ہیں اور بڑھتے ہوئے عالمی درجہ حرارت کی وجہ سے ان گلیشیئرز کے پگھلنے کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ ساتھ ہی جھیلوں کے پھٹنے اور ان سے سیلاب آنے کے خطرات بھی بڑھ رہے ہیں۔

سیلاب سے بچاو کیلیے انفرااسٹرکچر بنانے کی ضرورت ہے۔ سوین ایوین کا کہنا ہے کہ سیلاب سے بچاؤ کیلیے بنائے جانے والے انفرااسٹرکچر سے کئی سو گنا زیادہ معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت جو سیلاب سے سب زیادہ

متاثر ہوتا ہے، اگر سیلاب سے بچاؤ کے انفرااسٹرکچر پر ایک ڈالر خرچہ کیا جائے تو 248 ڈالر سے زائد کا معاشی فائدہ ہوتا ہے۔ اور یہ

انفرااسٹرکچر 11 سے 25 سال تک کارآمد رہ سکتا ہے۔

اسی طرح بنگلہ دیش میں سیلاب سے بچاؤ پر ایک ڈالر خرچ کرنے سے 123 ڈالر کا معاشی فائدہ ہوتا ہے۔ اور یہ انفرااسٹرکچر 3 سے 10 سال تک کارآمد رہتا ہے۔ انڈونیشیا میں سیلاب سے متعلق انفرااسٹرکچر پر 1 ڈالر کا خرچہ 33 ڈالر کا معاشی فائدہ پہنچاتا ہے۔ اور انفرااسٹرکچر 10 سے 25 سال تک کارآمد رہتا ہے۔ جبکہ برطانیہ میں سیلاب سے متعلق انفرااسٹرکچر پر سرمایہ کاری سے سالانہ 1.1 ارب برطانوی پاؤنڈ کی معاشی بچت ہوتی ہے۔

سوین کا کہنا تھا کہ پاکستان کو سیلاب سے نمٹنے کیلیے چین سے سیکھنا ہوگا۔ چند دہائیاں قبل چین کی صورتحال پاکستان جیسی تھی۔ 1998 کے سیلاب کے بعد چین نے سیلاب سے بچاؤ کیلیے دریاؤں کا ایک مربوط نظام، مقامی ایکوسسٹم کی بحالی اور معیشت کو ماحولیات سے منسلک کرنے کی پالیسی مرتب دی۔ اس پالیسی کے مطابق نشیبی علاقوں کے رہائشیوں کی منتقلی اور وہاں جنگل لگانا، درختوں کی کٹائی پر پابندی، ڈھلانوں پر زراعت کی ممانعت، قدرتی ماحول بحال کرتے ہوئے سیلاب کے خطرات کو روکنا شامل تھا۔ اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے چین نے تقریباً 20 لاکھ آبادی کو دریائے یان سی سے بے دخل کیا۔ برطانیہ بھی سیلاب سے متعلق انفرااسٹرکچر کی دیکھ بھال کیلیے 2027 تک 5.5 ارب برطانوی پاؤنڈ خرچ کرے گا۔

مگر کیا پاکستان کو سیلاب اور قدرتی آفات سے بچاؤ کا جو انفرااسٹرکچر تعمیر کرنا ہے اس کیلیے فنڈنگ دستیاب بھی ہے کہ نہیں۔ اس حوالے سے عالمی بینک کے ذیلی ادارے آئی ایف سی کے پاکستان اور افغانستان کے سربراہ ذیشان شیخ کا کہنا تھا کہ پاکستان میں گزشتہ 20 سال میں ماحولیاتی تبدیلی اور قدرتی آفات سے ہونے والے نقصانات کے مساوی نقصان حالیہ بارشوں میں ہوا ہے، جو کہ 30 ارب ڈالر سے زائد ہے۔ عالمی بینک پاکستان میں ہونے والے نقصانات کا جائزہ لے رہا ہے۔

اس رپورٹ کے تیار ہونے میں ایک دو مہینے لگیں گے۔

ذیشان شیخ کا کہنا تھا کہ سیلاب سے ہونے والی تباہی کو بہتر تعمیر کا موقع جاننا چاہیے اور جو تباہ ہوا ہے اس سے بہتر انفرااسٹرکچر تعمیر کیا جانا چاہیے۔ پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلی کے حوالے سے اہداف حاصل کرنے کیلیے سرمائے میں 600 فیصد سالانہ کا اضافہ کرتے ہوئے آئندہ دس سال کے دوران 230 ارب ڈالر سرمایہ کاری کی ضرورت ہے، جو کہ ابھی پاکستان کو دستیاب نہیں ہے۔

متاثرین کی بحالی اس وقت پاکستان کیلیے ایک بڑا چیلنج ہے کیونکہ سردیوں کے سخت موسم میں اگر انہیں مناسب رہائش فراہم نہ کی گئی تو اس سے انسانی المیہ مزید شدید ہوسکتا ہے۔ ارم ترین کا کہنا ہے کہ سیلاب کو ایک دیہی مسئلہ سمجھنا غلط ہوگا کیونکہ سیلاب کے بعد ٹیکسٹائل، ڈیری، مشروبات، چمڑے کی صنعت، فرٹیلائزر کی صنعت متاثر ہوئی ہیں اور اس سیلاب کے اثرات ملکی درآمدات اور برآمدات پر بھی پڑ رہے ہیں۔ کپاس کی فصل چنائی کے لیے تیار تھی۔ اس کے علاوہ چاول کی پیڈی کاشت کی جا چکی تھی۔ خیر پور، دادو، لاڑکانہ علاقے میں سیلاب آیا ہے، 20 فیصد باغات بھی تباہ ہوگئے ہیں۔ تمام سرمایہ کاری تباہ ہوگئی ہے۔ ایک طرف فصل تباہ ہوئی تو دوسری طرف کسان مزید قرض میں ڈوب گئے کیونکہ فصلوں کیلیے آڑھتی اور مڈل مین سے لیے گئے قرضوں کا بوجھ بھی چڑھ گیا ہے جبکہ 90 فیصد گھر مکمل طور پر تباہ ہوگئے ہیں۔

سیلاب متاثرین کی معاشی بحالی کے بغیر ملکی معیشت بھی بحال نہیں ہوسکتی۔

سیلاب اور بارشوں کے بعد اب جیسے جیسے پانی اتر رہا ہے تو متاثرین کی بحالی کا کام شروع کرنا ہوگا، کیونکہ بارش سے گھروں کے منہدم ہونے کے بعد متاثرین کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا، ان کے سروں کی چھت، پہننے کے کپڑے، گھروں کے برتن تک سیلاب میں بہہ گئے ہیں۔ متاثرین کی امداد اور معاونت اس طرح کی جائے کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور ان کے گھروں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ان کی معیشت یعنی زراعت اور مویشی پر پوری اور مقامی مارکیٹس کی بحالی کرنا ہوگی۔

پاکستان کو جی 20 ملکوں کی جانب سے گرین ہاؤس اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیسوں کے اخراج کی وجہ سے موسمی شدت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان ملکوں کی ذمے داری ہے کہ وہ پاکستان میں موسمی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی مشکلات اور انسانی المیے میں پاکستان کو مالی اور تکنیکی معاونت فراہم کریں۔ یہ کر کے وہ پاکستان پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہوں گے بلکہ پاکستان کے ساتھ انصاف کریں گے، کیونکہ ان کی ترقی کی قیمت پاکستان چکا رہا ہے۔ اس لیے پوری دنیا کو پاکستان کی مدد کرنا ہوگی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر سیلاب سے شہر تو متاثر نہیں ہوئے مگر شہری معیشت بری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ غذائی اجناس کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، مویشیوں کے مرنے سے دودھ اور چمڑے کی صنعت متاثر ہے جبکہ کپاس کی فصل تباہ ہونے سے ٹیکسٹائل کی صنعت کو 2 ارب ڈالر سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس لیے اگر شہروں میں افراط زر اور ملازمت کے مواقع پیدا کرنا ہیں تو سیلاب متاثرین کی معاونت ضروری ہے۔ حکومت اور عالمی ادارے تو متاثرین کی مدد کریں گے ہی، پاکستان کی سول سوسائٹی بھی مدد میں پیش پیش ہے۔ مگر اس قدر مدد نہیں کی ہے جس سے متاثرین بحال بھی ہوسکیں۔

شہروں پر پہلے ہی آبادی کا بہت زیادہ دباؤ ہے اور شہر مزید آبادی کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ شہری انفرااسٹرکچر بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور اگر موسمی تبدیلیوں سے متاثرہ افراد کی بحالی پر فوری اقدامات نہ اٹھائے گئے تو کلائمیٹ چینج کی وجہ سے ہجرت کرنے والے شہروں کا رخ کریں گے۔ جس سے شہری مسائل میں اضافے کے علاوہ کشیدگیوں میں ابھی اضافے کے خدشات ہیں۔

اس لیے وہ تمام پاکستانی جو سیلاب سے محفوظ رہے ہیں، انہیں سیلاب متاثرین کی بحالی کیلیے خود بھی عطیہ کرنا ہوگا۔ پاکستان میں سیلاب متاثرین تاحال عالمی، حکومتی اور ہماری امداد کے منتظر ہیں۔ ملک کی آبادی کا بڑا حصہ کئی ماہ گزر جانے کے باوجود کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ ان افراد کی فوری بحالی اور انہیں چھت نہ دی گئی تو معاشرے میں پیدا ہونے والا عدم توازن بہت کچھ بہالے جائے گا۔

# پاکستان واحد ملک ہے جہاں 70 فیصد نوجوان بیکار ہیں، فراز الرحمٰن

## ان کو ملک کے لئے کارآمد بنایا جائے۔ ہم غربت ختم کرنا نہیں چاہتے۔ غریبوں کی موجودگی میں تو سیاست چلتی ہے۔

## آپ ایک کروڑ خاندانوں کو 3000 روپے دے رہے ہیں آپ 100 خاندانوں کو پاؤں پر کھڑا کر دیں وہ اگلے 20 خاندانوں کو سپورٹ کر دیں گے

## ہمیں فوڈ انڈسٹری کے لئے زمینیں الاٹ کی جائیں تاکہ ہم وہاں صنعتوں کا جال بچھائیں اور اپنی مدد آپ کے تحت چلائیں

## گڈاپ ٹاؤن میں جہاں سبزی کاشت ہوتی تھی اور شہر کی ضرورت پوری کرتی تھی وہاں ہاؤسنگ سوسائٹیاں لانچ کر دی گئیں

## اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ سود مجھ سے جنگ ہے آپ ایک ایس ایچ او، ایک سپاہی سے تو لڑ نہیں سکتے اللہ اور اس کے رسول سے کیا جنگ کریں گے

## 1970 میں کاٹی کی بنیاد میرے والد حاجی فضل الرحمٰن نے رکھی۔ کورنگی ایسوسی ایشن آف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری کے صدر کا ہیومن رائٹس پوسٹ کو انٹرویو

انٹرویو: ملک منور حسین فوٹوگرافر: دلشاد غوری

کورنگی ایسوسی ایشن آف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری (کاٹی) کے صدر فراز الرحمان معروف کاروباری، خوش اخلاق نوجوان شخصیت ہیں، جو گزشتہ کئی برس سے نا صرف بہتر کاروبار کے ذریعے ملک کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کیلئے کوشاں ہیں، بلکہ دن رات فلاحی کام کر کے بزنس کمیونٹی اور عوام کے دل جیت رہے ہیں۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو کاروبار کو خدمت سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنی زندگی مخلوق خدای خدمت کر کے اللہ کی رضا میں گزارتے ہیں۔ ایسے نیک لوگوں میں فراز الرحمان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ آپ کم عمری میں ہی کاروبار سے وابستہ ہوگئے، بزنس کمیونٹی کے بڑھتے ہوئے مسائل کے حل کے لئے ایک پلیٹ فارم کی پاکستان بزنس گروپ کے نام سے بنیاد رکھی، جس کے بانی و چیئرمین ٹھہرے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان ساری زندگی سیکھنے کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ میں نے بھی اپنے بڑوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور یہ سفر جاری وساری ہے، کاٹی میرا گھر ہے۔ بچپن سے ہی تعلق قائم ہوا۔ 2003 سے باقاعدہ ممبر بنا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار اور دوستوں کا مشکور ہوں، جنہوں نے کاٹی جیسے معتبر ادارے کی صدارت کیلئے مجھے منتخب کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ کاٹی کا کردار ملکی معیشت میں انتہائی اہم ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والوں کی اکثریت کا تعلق بھی کاٹی سے ہے۔ فراز الرحمان سے ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں انکے خاندانی پس منظر، خدمات ملکی سیاسی ومعاشی صورتحال، بزنس کمیونٹی کو درپیش مسائل، کاٹی کے انتظامی معاملات پر تفصیلی گفتگو ہوئی، جسکا خلاصہ پیش خدمت ہے:

نمائندہ ہیومن رائٹس: سب سے پہلے تو اپنے بارے میں بتائیں اور کاٹی کے معاملات پر روشنی ڈالیں۔ جب سے آپ نے منصب سنبھالا ہے، ٹارگٹ کیا ہے اور مشکلات کیا ہیں؟

فراز الرحمٰن: پہلے تو میں آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ عہدے عارضی ہوتے ہیں، دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ آپ کا وژن اور مشن کیا ہے؟ عہدے کی ایک اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اب مثال کے طور پر کورنگی ایسوسی ایشن ٹریڈ اینڈ انڈسٹری ہے۔ اگر میں آپ کو اس کا ایک جائزہ پیش کروں تو 1970 میں اس کی بنیاد میرے والد حاجی فضل الرحمان صاحب نے رکھی۔ کورنگی کا یہ علاقہ جنگل ہوا کرتا تھا، صرف سیکٹر 27 اور 28 آباد تھے۔ کسی بھی نئی انڈسٹری کے لیے شروع میں بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ کورنگی ایسوسی ایشن ٹریڈر انڈسٹری کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ آنے والے تمام چیئرمین نے اپنا حصہ ڈال کر کورنگی ایسوسی ایشن کو ایک مقام پر لا کھڑا کیا اور آج پوری دنیا میں اس کا ایک نام ہے۔ پورے ملک میں ایوان صدر سے ایوان وزیراعظم تک سنوائی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے کئی دہائیوں کے بعد ہمارے خاندان پر اللہ کی مہربانی ہوئی ہے۔ جب سے منصب سنبھالا، کلین اینڈ گرین کورنگی انڈسٹریل ایریا میرا مشن ہے۔ انشاء اللہ کلین اینڈ گرین ماحول کورنگی انڈسٹریل ایریا کو دیں گے۔ ہم پاکستان بننے کے پہلے سے بزنس ہاؤس ہیں۔ جیسا کاروباری لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، ویسا ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ اچھا وقت بھی دیکھا، برا وقت بھی دیکھا، مگر والدین کی تربیت رہی کہ آپ نے شارٹ کٹ پر نہیں جانا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ کاروبار میں قدم رکھا تو اس وقت میری عمر صرف 17 برس تھی۔ اس وقت سے میں کام کر رہا ہوں اور الحمدللہ بہت سارے تجربے کیے اور بہت کچھ سیکھا۔

میرے والدین اور بڑے بھائی نے بہت کچھ سکھایا ہے۔ جب الگ بزنس شروع کیا تو دنیا نے بہت کچھ سکھایا۔ جب دنیا کی ماریں پڑتی ہیں تو آپ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ میں صرف ایک میسج نوجوانوں کو دینا چاہتا ہوں کہ no is there shortcut اگر آپ کی منزل بہت بڑی ہے تو ضرور ڈیفائن کریں، جیسے میں نے بھی اپنی منزلیں ڈیفائن کی ہیں، مگر شارٹ ٹارگٹ لیکر چلیں تاکہ آپ وہ حاصل کریں۔ پھر آگے بڑھیں، پھر حاصل کریں۔ یوں آپ آگے بڑھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو بچے تعلیم حاصل کرتے ہوئے آگے تعلیم دینا شروع کر دیتے ہیں، نوکری کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کما کر پیسے دے رہے ہوتے ہیں، وہ بچہ آپ دیکھیں گے کہ قابل نکلے گا کیونکہ اسے ایک احساس ہو جائے گا کہ اسے اپنی اکنامی کیسے چلانی ہے؟ آپ اپنی اولاد کو چودہ پندرہ سال کی عمر میں احساس دلا دیں گے تو اس کو اندازہ ہو جائیگا کہ پیسہ کمایا کیسے جاتا ہے؟ جب اسے احساس ہو جائے گا تو وہ بڑا ہو کر بہتر اکنامی چلائے گا۔ ہمارا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ چالیس، چالیس سال تک ہمارا بچہ انڈیپینڈنٹ نہیں ہوتا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں والدین کی ہی غلطی ہے کہ وہ بچے کو جنگل کا شیر بنانے کے بجائے سرکس کا شیر بنا دیتے ہیں۔

میرے دادا حاجی محمد یونس کے نام سے ایم وائے کارپوریشن ہے، جو ان کا نام ہے محمد یونس میرے دادا نے ہجرت کی، ہندوستان سے یہاں آئے۔ میرے والد نے بڑی محنت کی، میرے دادا ضعیف ہو گئے تھے۔ والد صاحب کو ٹیک کیئر کرنا پڑا۔ بہنوں کی شادی اور دیگر سارے معاملات۔ ابتدائی طور پر تو وہ جوانویسٹمنٹ لے کر آئے تھے، وہ لوٹ مار میں سب برابر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی محنت شروع کی۔ تین ہٹی سے اپنے گھر کا سودا اپنے کندھے پر رکھ کر لاتے تھے۔ ہم کپڑے والے کہلاتے ہیں۔ وہ تھانوں کو اپنے کندھے پر رکھ کر ڈیلیور کرتے تھے کہ ان کو مزدوری نہ دینی پڑے۔ اس سے انہوں نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا۔ انہوں نے اپنی ایک ایمپائر بنائی اور اللہ کے فضل و کرم سے وہ کاٹی کے بھی بانی بنے۔ آباد کے بھی بانی بنے اور جمعیت برادران دہلی چیریٹی کے بھی۔ بلوچستان ہو یا سندھ، ہر جگہ چیریٹی میں آگے رہتے تھے۔ دکھ اور درد والا دل ان کے اندر تھا۔ لوگوں کی خدمت کرتے تھے، لوگوں کے لیے آگے بڑھتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کا بہت کم عمر میں انتقال ہو گیا، اس وقت میں دس برس کا تھا، جب میرے والد کا انتقال ہوا اور ظاہر ہے، بہت کم لوگ ہوتے ہیں، سپورٹ کرنے والا جبکہ ایمپائر کو ختم کرنے والے لوگ بہت زیادہ ہوتے ہیں تو ہمیں بھی اس اسٹیج سے نکلنا پڑا اور پھر الحمدللہ نے پھر ایک بار کھڑا کیا اور اللہ نے ہمیشہ عزت دی۔ چیٹنگ، فراڈ دنیا میں ان سب چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم بھائیوں نے ہمیشہ محنت کی اور ہم تو یہی دعا کرتے ہیں کہ آگے بھی اللہ تعالیٰ ہم سے لوگوں کی بھلائی کا کام لیتا رہے۔ ہم چھ بھائی ہیں، ہم سب کا الگ الگ بزنس بھی ہے اور مشترکہ بزنس بھی ہے۔ ہم ایم وائے گروپ آف کمپنیز کے اندر کام کر رہے ہیں۔ ہم ٹیکسٹائل اور کنسٹرکشن میں بھی کام کر رہے ہیں، اس کے علاوہ شپنگ میں بھی کام کر رہے ہیں۔

نمائندہ ہیومن رائٹس: آپ وفاقی حکومت کی جانب سے کسان پیکیج اور سود سے پاک معیشت کے فیصلے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

فراز الرحمٰن: میں وزیر اعظم صاحب کا بہت مشکور ہوں، جنہوں نے کسان پیکیج لانچ کیا۔ بس یہ صحیح طریقے سے استعمال ہو جائے، کرپشن کی نذر نہ ہو۔ شفافیت کے ساتھ کسانوں تک پہنچ جائے، بہت فائدہ مند ہوگا اور اس کے ساتھ ایک چیز اور ایڈ ہو جائے کہ پٹے پر تیس سالہ پینتیس سالہ لیز پر زمین دے دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بہترین اسکیم ہے۔ اس سے ہم خود کفیل ہو جائیں گے۔ آپ نے سوال پوچھا، اسحاق ڈار

صاحب کا کہ انہوں نے سودی معیشت کے خلاف ایک بات کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ سود مجھ سے اور میرے رسول سے جنگ ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ آپ ایک ایس ایچ او سے تو لڑ نہیں سکتے، آپ ایک سپاہی سے تو لڑ نہیں سکتے تو اللہ اور اس کے رسول سے کیا جنگ کریں گے؟ جب آپ کا سسٹم ہی صحیح نہیں ہوگا۔ اسحاق ڈار صاحب ایسا قدم اٹھا رہے ہیں تو اللہ ان کو ہمت اور طاقت دے، میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔ یہ یقینی طور پر اچھا فیصلہ آ گیا ہے اور اسے آگے چیلنج نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پاکستان میں سود کا نظام ختم کر دینا چاہیے۔

نمائندہ ہیومن رائٹس: بزنس کمیونٹی ملکی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے، گیس، بحران سمیت مختلف ایشوز ہیں آپ اسٹیک ہولڈر ہیں، حکومت کے ساتھ مل بیٹھ کر معیشت کی بحالی کے لئے حکمت عملی کیوں نہیں بناتے؟

فراز الرحمٰن: ڈومیسٹک گیس اگر 500 کی جگہ 2 ہزار کی کر دیں گے اور اسی گیس سے اگر بجلی بنے تو آپ 15 ہزار کے بل کو 7 ہزار کر سکتے ہیں ہمارے پاس سب کچھ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں تمام چیزیں دی ہوئی ہیں، مگر صرف اس کی درست تقسیم کیسائل ہیں۔ اگر ہمیں یہ ڈسٹری بیوشن سمجھ آ جائے کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟ شفافیت کا عالم یہ ہے کہ ایک جگہ 40 ہزار کا بل دے رہے ہیں تو دوسری جگہ ہم گیس کا بل 3 ہزار روپے دے رہے ہیں۔ اگر ہم 5 ہزار یا ہزار روپے کا بل دے دیں اور چوروں کے لئے ایل پی جی گیس یا دوسری کوئی گیس استعمال کر لیں اور وہ ڈومیسٹک سے نکل کر اسی گیس کی بجلی بن جائے تو بجلی سستی نہ مل جائے گی اور باقی ان چیزوں پر حکومت کا فرض ہے کہ وہ آواز اٹھائے اور اس پر کام کرے۔ ہمارا کام ہے پالیسیاں دینا، ہم اسٹیک ہولڈرز ہیں، ہمیں ہمیشہ بیک فٹ پر رکھا جاتا ہے۔ ہمیں پتا ہے۔ انڈسٹریز پلاٹ کی لانچنگ ہوتی ہے یا کوئی اور چیز ہوتی ہے نوجوانوں کے لیے فیسلیٹی کہاں ہے؟ دنیا بھر میں ینگ جنریشن کو استعمال کیا جاتا ہے، مگر پاکستان واحد ملک ہے، جہاں پر 70 فیصد نوجوان بیکار ہیں۔ ان کو ملک کے لئے کارآمد بنا دیا جائے۔ یہ ملک کی قوت بننے کے بجائے والدین اور ملک کے اوپر بوجھ بن گئے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ قوم کو بھکاری بنا دیا گیا ہے۔ ہم لوگ ان کے لیے جاب اور فنڈ نہیں دے پا رہے۔ اربوں روپے بینظیر انکم سپورٹ فنڈ میں یا کسی اور فنڈ میں جا رہیں۔ اسی طرح اگر آپ ایک کروڑ خاندان کو 3 ہزار روپے دے رہے ہیں تو بھائی آپ صرف 100 خاندانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیں۔ وہ اگلے 20 خاندانوں کو سپورٹ کر دیں گے اگلے ماہ پھر آپ 100 خاندان کھڑے کر دیں۔ پھر 100 خاندان اور کھڑے کر دیں، اس سے غربت کا تناسب کم ہو جائے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم غربت ختم کرنا نہیں چاہتے۔ غریبوں کی موجودگی سے تو سیاست چلتی ہے، اسی لئے ہم غربت ختم ہی نہیں کرنا چاہتے۔ اسلام کا اصول ہے۔ ایک وقت یہ تھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں تھا۔ سودی نظام سے نکل کر اصل معاملات پر آ جائیں تو آپ بہترین نظام لا

سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑا بزنس مین ٹیکس میں چوری کر سکتا ہے، مگر زکوٰۃ؟ میں چوری نہیں کرتا، کیوں کہ زکوٰۃ جسٹیفائڈ ہے، ٹیکس جسٹیفائڈ نہیں ہے۔ ٹیکس کے اندر اگر آپ ٹیکس دے بھی دیں تو وہ کہتا ہے کہ ایسا ہے، ایسا نہیں ہے۔ کاروبار چل رہا ہے، نہیں چل رہا، تب بھی ٹیکس دے رہے ہیں آپ بھلے ادھار مانگ کے کھا رہے ہیں، تب بھی ٹیکس دے رہے ہیں آپ ایک دفعہ ٹیکس میں رجسٹرڈ ہو کر تو دیکھیں بات یہ ہے کہ ہر چیز کا ایک سسٹم ہے۔ اس سسٹم کے تحت چیزیں ہونی چاہئیں، اگر ایک شخص اچھے وقت میں ٹیکس دے رہا ہے اور آج وہ کرائسز میں ہے، ادھار لے کے دے رہا ہے، پھر بھی آپ کو ٹیکس دے رہا ہے۔ مطلب اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کس طرح کی پالیسی ہے کہ لے جاؤ، لے جاؤ، لے جاؤ۔ مطلب یہ کہ کوئی بیمار انڈسٹریز کو سپورٹ کرتا ہے کہ آج بند ہو رہی ہے کل اس کا ٹیکس یہ تھا۔ آج یہ عالم ہو گیا ہے کہ جائیں آڈٹ کریں، رپورٹ کریں کہ بھائی ان کو پیسوں کی ضرورت ہے بلا سود ان کو قرضہ دیں یا کچھ اور کر دیں مگر نہیں۔ ایک طرف نعرہ لگتا ہے کہ چین بنائیں گے، کوئی نعرہ لگاتا ہے کہ روٹی کپڑا مکان دیں گے آپ مجھے یہ بتاؤ کہ اب کسی کی آبروجی رہ گئی ہے۔ آپ کی بیوی بھی باہر سے روٹی منگواتے ہوئے چار دفعہ سوچتی ہے کہ ضائع نہ ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ یہ جو معاملات ہیں، یہ جو تکلیفیں، ہیں یہ جو دکھ ہیں ان کو سمجھنا ضروری ہے، ان کے رنگ میں رنگ جائیں۔ ابتدائی طور پر اپ کے فنڈز کو درست طریقے سے استعمال کیا جائے۔ بات یہ ہے کہ پاکستان میں بہت استعداد ہے، مگر اس کا درست استعمال نہیں کیا جا رہا۔

فوڈ انڈسٹری اور کمیونٹی سینٹر کے لئے زمین نہیں، جس کی اشد ضرورت ہے۔ حکومت سے ہماری درخواست ہے کہ لانڈھی کورنگی میں ایکسٹرا جو نا کلاس زمین ہے اور کچھ دوسرا ایریا بھی ہے، اسے کورنگی ایسوسی ایشن کاٹی لمیٹڈ کی نگرانی میں دیا جائے۔ فوڈ انڈسٹریز کے لئے زمین درکار ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسی علاقے میں ہمیں فوڈ انڈسٹریز کے لئے زمین الاٹ کی جائے تا کہ ہم وہاں صنعتیں کا جال بچھائیں اور اپنی مدد آپ کے تحت اس کو چلائیں اور آپ کے توسط سے اگر یہ بات حکام بالا تک پہنچ جائے تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہم اس پر کام بھی کر رہے ہیں اور دوسرا اس کے علاوہ ہمیں کمیونٹی سینٹر کے لیے بھی جگہ کی ضرورت ہے اور جو ہماری ضرورت ہے، اس کے حساب سے جو قریب ترین جگہ ہو۔ چاہے اس کے لئے ہمیں کسی پارک کو آن کرنا پڑے، ہم اس پر بھی کام کر رہے ہیں اس کے لئے بھی ہمیں حکومت کے تعاون کی ضرورت ہے۔ مضافاتی علاقوں میں ساری سوسائٹیاں لانچ کر دی گئیں۔ جیسے گڈاپ ٹاؤن ختم ہو گیا، گڈاپ ٹاؤن وہ ٹاون تھا جہاں پر آپ کی سبزی ترکاری کاشت ہوتی تھی، جو کراچی کی ضروریات کو پوری کر دیتی تھیں اور لمبے سفر سے جان بچ جاتی تھی مگر بدقسمتی سے اب مسافت لمبی ہو گئی ہے، کیونکہ سبزی کم سے کم حیدر آباد سے یا پھر نیشنل ہائی وے سے آئے گی۔ بحریہ ٹاؤن کے آس پاس کی زمینیں تو کروڑوں کی ہو گئی ہیں، اب بھی سستی زمینیں پڑی ہیں آپ لوگوں کو چاہئے پر زمین دیں تا کہ لوگ کاشت کریں، آلو پیاز وغیرہ کی فصل اگائیں۔ الحمدللہ ہماری زرخیز زمین ہے، پورا پاکستان بھرا پڑا ہے۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود ہمیں ٹماٹر درآمد کرنے پڑ رہے ہیں تو پھر اس میں حکمرانوں کی غلطی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان سب چیزوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے، ان سب چیزوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک کاؤنٹر یٹ 20 سالہ چارٹرڈ آف اکنامک بنے، اس کے اندر چلے ہوئے کارتوسوں کو الگ کرنا ہوگا ماضی میں جنہوں نے 30 سال اکانومی چلائی ہے، ان کے پاس اگر اتنی ہوتی عقل تو پاکستان کہیں سے کہیں چلا گیا ہوتا۔ نئے برانڈز، ینگ یوتھ اور بزنس مینوں کو لے کر آئیں پھر آپ دیکھیں کہ آپ کا ملک کیسے گروتھ کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ پاکستان میں استعداد بہت ہے اسے ہم خود ضائع کر رہے ہیں۔ اپنی ذات اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر خود دیکھیں کہ ہم پاکستان کو کیا دے رہے ہیں؟ ہر بندہ یہ سوال کرتا ہے کہ پاکستان ہمیں کیا دے رہا ہے؟ ہم کیا دے رہے ہیں؟ یہ کوئی نہیں کہتا۔

نمائندہ ہیومن رائٹس پوسٹ: آپ نہیں سمجھتے کہ کورنگی کو کلین اینڈ گرین بنانے کے ساتھ ساتھ سی سی ٹی وی کیمروں کی بھی ضرورت ہے، تا کہ کورنگی انڈسٹریل ایریا کو سیف زون بنایا جا سکے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فرازالرحمٰن: یہ پہلی کامیابی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوگی اور واٹر بورڈ کی جو منظور شدہ گاڑیاں ہیں، وہ دو ہم نے اپنے آپریشن میں رکھی ہیں۔ یہ وقف ہیں کورنگی ٹریڈ ایسوسی ایشن کے لئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم مشینری اور ٹریکٹر ٹرالی کی طرف بھی جا رہے ہیں۔ کمیونٹی بیس پر جو چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں، انہیں حل کرنے کے لیے ہم خود بھی طاقت رکھتے ہیں گورنمنٹ اور پرائیویٹ پارٹنرشپ کے ساتھ ہم کوشش کریں گے کہ اس علاقے کو خوب سے خوب تر بنائیں۔ اس حوالے سے جو ہمارے انڈسٹریز کے لوگ ہیں، ان سے بھی میں نے ون ٹو ون میٹنگ کی ہے اور میں اس پر بھی ورک کر رہا ہوں کہ کسی طرح سے ہر کوئی اپنے سامنے کے روڈ کو اون کرنا شروع کر دے۔ بات یہ ہے کہ تنقید شروع ہوتی ہے اپنے گھر کے سامنے سے۔ حکومت ایک مرتبہ روڈ بنا دیتی ہے مگر آپ کے سامنے سے کوئی گٹر کا ڈھکنا چوری کر کے جا رہا ہے تو اس کو محفوظ رکھنا آپ کی بھی ذمہ داری ہے۔ اسی طریقے سے میں سمجھتا ہوں کہ آہستہ آہستہ بہتری آئے گی۔ کمیونٹی بیس پر ہم سب لوگ ایک جگہ پر جمع ہو جائیں گے اور سب موبلائز ہو جائیں گے، ممبر ہوں یا نہ ہوں، ہمیں تو پورے کورنگی انڈسٹریل ایریا کو دیکھنا ہے۔ سب ہمارے بچے ہیں اور وہ سب بھی ہم سے ہی توقعات رکھتے ہیں اور ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بلا تفریق سب کے کام کریں اور وہ ہم کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک پروجیکٹ ہے، جو ہم لانچ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہمارا بجٹ بھی منظور ہو گیا ہے۔ ہم سی سی ٹی وی کیمرے انسٹال کریں گے، تمام بڑی شاہراہوں پر اور اس کا کمانڈ اینڈ کنٹرول یہاں پر رکھیں گے۔ یہ ہم نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس کے بعد ڈی آئی جی آئی ٹی کے ساتھ مل کر سب سے پہلے ایک یو پی ایس سسٹم یہاں پر لانچ کروایا اور اب الحمدللہ بہت ساری کمپنیوں نے یو پی ایس سسٹم لے لیا ہے آپ کو پتہ ہوگا، اے پی ایس سسٹم میں بلوچ کی ویری فکیشن کے حوالے سے سسٹم ہوتا ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ آپ کے یہاں کچھ ایسے عناصر ہیں جو کرائم کر کے آئے ہوئے ہیں اور یا آپ کے یہاں چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ایک لبادہ اوڑھ کر آپ کے درمیان موجود ہیں۔ ایک علاقائی معاملات ہیں، جیسے ایک چھوٹی موٹی دکان خالی کرواتے ہوئے جھگڑا ہو گیا اس طرح کے ڈومیسٹک معاملات میں بھی بعض اوقات ایف آئی آر درج ہو گئی ہوتی ہے مگر اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر جرائم کی واردات یا قتل میں کوئی ان کا آدمی ہے تو وہ یقیناً شناخت ہو جائے گا کہ یہ اس جرم میں ملوث رہا ہے۔ اس کے لیے کورنگی ایسوسی ایشن میں باقاعدہ سیٹ اپ بھی لگایا گیا ہے۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ یہ دو کام ہمارے ہو گئے ہیں اور تیسرا کیمرے کا کام بھی ہمارا ہو جائے گا۔ پیٹرولنگ پروجیکٹ جو ہم نے 2013 میں شروع کیا تھا جب میں پارٹی کا نائب صدر تھا اور میں چاہوں گا کہ اس کو دوبارہ آپریٹ کریں تا کہ اس مقام پر ہماری جو رسپانس ٹیم ہو، وہ فوری طور پر وہاں پہنچے۔ حاجی صاحب سے بھی ہم درخواست کر رہے ہیں، ہمیں رسپانس ٹیم دی جائے۔ سی سی ٹی وی ہوگی ہمارے پاس۔ جس کے لئے ایک بندہ ہم نے متعین کیا ہوا ہے۔ ساتھ میں ریلیف بھی ہوگا اور جو ریٹائرڈ پی ایس پی ہیں، ان کو بھی ہم نے ہائر کیا ہے تا کہ ہم رسپانس کریں۔ اور بزنس کمیونٹی تحفظ کے ساتھ اپنی کاروباری سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔

# بلدیاتی نظام
# جمہوری معاشرے کی ضرورت

ضیاالرحمن ضیا

اسلام آباد میں بلدیاتی انتخابات کی تیاریاں زوروں پر ہیں، تمام امیدوار اپنے حلقوں میں متحرک ہیں اور ووٹ لینے کیلیے کوششیں کررہے ہیں۔ روزانہ کی بنیادوں پر لوگوں سے ملاقاتیں بھی کررہے ہیں اور کارنر میٹنگز اور چھوٹے موٹے جلسے بھی منعقد ہورہے ہیں۔

اسلام آباد کی تمام یونین کونسلوں میں بلدیاتی انتخابات کی تیاریوں کا سلسلہ جاری ہے۔ بہت سے امیدوار میدان میں ہیں جن میں کئی امیدوار سیاسی جماعتوں کی طرف سے ہیں جبکہ آزاد حیثیت سے بھی انتخابات میں حصہ لیا جارہا ہے۔ امیدوار اپنی تشہیر پر بھی رقم خرچ کررہے ہیں۔ کسی جگہ بڑے بڑے سائن بورڈز لگادیے گئے ہیں اور کہیں چھوٹے بڑے پینافلیکس آویزاں کردیے گئے ہیں۔ گلی محلوں میں ہر طرف کھمبوں پر امیدواروں کے پینافلیکس اور بینرز نظر آرہے ہیں جن میں وہ عوام سے ووٹ کی اپیل کررہے ہیں، جو کہ جمہوری سیاست کا ایک اہم حصہ ہے۔

ظاہر ہے کہ الیکشن میں اسی لیے حصہ لیا جاتا ہے کہ عوام ووٹ دیں گے اور اس کے بعد وہ عوام کیلیے کام کریں گے۔ بنیادی طور پر تو سب اپنا یہی مقصد بتاتے ہیں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ عوام کے کام کرنے کیلیے انہیں فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ فنڈز کے بغیر تو کوئی شخص بھی کام نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی امیدوار ایسا ہوتا ہے جو اپنی جیب سے رقم خرچ کرے۔ چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی جیب سے ترقیاتی کام کروا بھی دیتے ہیں لیکن ایسے لوگ انتہائی کم ہوتے ہیں۔

اب جب تمام امیدوار اپنی جیب سے رقم نہیں خرچ کرتے بلکہ تمام امیدوار خرچ کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے کیونکہ ترقیاتی کاموں کیلیے اچھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے، اس کیلیے کروڑوں روپے کے فنڈز درکار ہوتے ہیں، ہر شخص کے پاس تو کروڑوں روپے کے فنڈز موجود نہیں ہوتے، اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ حکومت انہیں فنڈ جاری کرے اور وہ عوام کیلیے کام کریں۔ جن کاموں کا وعدہ کرکے انہوں نے عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے۔

وطن عزیز پاکستان کا بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں پر بلدیاتی نظام مضبوط نہیں ہوسکا اور اس کی راہ میں خود جمہوری نمائندے ہی رکاوٹ بنتے ہیں، جو خود کو جمہوری تو کہتے ہیں لیکن وہ بلدیاتی نظام کو منظم یا مضبوط نہیں کرنا چاہتے ہیں۔

جمہوری معاشرے کے لیے بلدیاتی نظام انتہائی اہم ہوتا ہے کیونکہ بلدیاتی نمائندے ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو عوام کے بہت قریب ہوتے ہیں اور عوام اپنے مسائل باآسانی ان تک پہنچاسکتے ہیں۔ قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران کا تو ایک بہت بڑا حلقہ ہوتا ہے، وہ پورے حلقے کے لوگوں کے مسائل نہیں سن سکتے، انہیں قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرنا ہوتی ہے، قومی اسمبلی کے اندر قانون سازی کے عمل میں شریک ہوتے ہیں، دیگر بڑے اجتماعات میں شرکت کرنا اور کئی طرح کے کام ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے حلقے میں زیادہ نہیں جاسکتے۔ جس کی وجہ سے عوام اپنے مسائل حکومت تک نہیں پہنچاسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بلدیاتی نظام کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ بلدیاتی انتخابات کے ذریعے جو نمائندے منتخب ہوتے ہیں وہ عوام کے قریب ہوتے ہیں، اس کے ذریعے اختیارات انتہائی نچلی سطح تک عوامی حقیقی نمائندوں تک منتقل ہوجاتے ہیں۔

یہ یونین کونسل کی سطح کے نمائندے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے وارڈ ہوتے ہیں جو ایک یا دو محلوں پر مشتمل ہوتے ہیں، جن کا ایک نمائندہ ہوتا ہے جو جمہوری طریقے سے ووٹ لے کر منتخب ہوتا ہے۔ یہ عوامی نمائندے عوام کے قریب ہوتے ہیں جن سے وہ کسی بھی وقت ملاقات کرسکتے ہیں، یہ عام طور پر ان کے محلے دار، رشتے دار ہوتے ہیں۔ اس لیے عوام کو اپنے مسائل حکام بالا تک پہنچانا اس نظام کے ذریعے بہت آسان ہوجاتا ہے۔

تمام جمہوری معاشروں میں بلدیاتی نظام رائج ہوتا ہے جس کے ذریعے سے عوامی مسائل باآسانی حل ہوجاتے ہیں لیکن ہمارے معاشرے میں حکومت پہلے تو چاہتی ہی نہیں کہ بلدیاتی انتخابات ہوں کیونکہ ایم این اے اور ایم پی اے کہتے ہیں کہ بلدیاتی نمائندوں کے ذریعے کام ہوگا تو ہمارے ووٹ کم ہوجائیں گے۔ کیونکہ وہ بھی قانون سازی کیلیے تو اسمبلی میں جاتے نہیں، وہ بھی لوگوں کی نالیاں گلیاں بنا کر ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا کام یہ نہیں ہوتا، یہ کام تو بلدیاتی نمائندوں کا ہوتا ہے۔ تو جب وہ اس راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تو عدالت کے حکم پر بلدیاتی انتخابات کرائے جاتے ہیں۔ جب بلدیاتی انتخابات ہوجاتے ہیں اس کے بعد بلدیاتی نمائندوں کو اختیارات نہیں دیتے، جس کی وجہ سے وہ عوام کے کام نہیں کرواسکتے تو پھر بلدیاتی نظام کا یا انتخابات کروانے کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ پھر یہ ایک بے سود مشق بن جاتی ہے جس پر خرچہ بھی ہوتا ہے اور وقت بھی برباد ہوتا ہے۔

حکومت کو چاہیے اس نظام کو ملک میں صحیح معنوں میں نافذ کرے اور بلدیاتی نظام کو مضبوط بنائے تاکہ عوام کی فلاح و بہبود کے کام باآسانی ہوسکیں اور ایم این ایز، ایم پی ایز کے جو کام ہیں وہ اپنے کام جاری رکھیں اور بلدیاتی نمائندوں کو اپنے کام کرنے دیں۔ ان کیلیے اچھی طرح فنڈ جاری کریں تاکہ وہ عوام کے کام آسانی کرسکیں اور عوامی مسائل عوامی سطح پر ہی حل کرسکیں۔ اگر ان کا پہلے سے ہی فنڈز جاری نہ کرنے کا ارادہ ہے، جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہے تو پھر بلدیاتی انتخابات ہی نہیں کرانے چاہئیں۔

زیادہ بہتر یہی ہے کہ بلدیاتی انتخابات ہونے چاہئیں اور اختیارات نچلی سطح پر منتقل کردینے چاہئیں تاکہ عوام اپنے قریبی نمائندوں کے ذریعے اپنے مسائل خود حل کرنے کے قابل بنیں۔

# ریٹائرمنٹ کے بعد مخلوق خدا کی خدمت کا شوق ہے، سید عامر رشید

## آغا شفیق درانی جو آغا سراج درانی کے بھائی ہیں انہوں نے بہت کچھ سیکھایا اور کہا کہ کبھی تعصب نہ کرنا

## ہمارے موجودہ ایم ڈی اور سی ای او بہت زیادہ پازیٹیو ہیں۔ ریکوری کو بہتر کرنے کے اقدامات کر رہے ہیں

## ادارہ میں ہر آدمی نے مجھے سکھایا۔ کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے ڈائرکٹر اکاؤنٹس کی ہیومن رائٹس پوسٹ سے گفتگو


انٹرویو: ملک منور حسین

فوٹو گرافر: دلشاد غوری


فرمان رب تعالیٰ ہے کہ محنت تو کر صلہ میں دونگا، جی ہاں بے شک محنت میں ہی عظمت ہے۔ انسان اپنی محنت لگن شعور اور جستجو دور اندیشی سے کامیاب ہوتے ہیں اور وہ مقام حاصل کرتا ہے جو معاشرہ کا چمکتا دھمکتا ستارہ ہوتے ہیں تعلیم ہی وہ ہے جو انسان کو زمین سے آسمان تک پہچاتی ہے۔ آج کل نوجوان تعلیم تو حاصل کرتے ہیں مگر وہ شارٹ کٹ کی تلاش میں بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں ایسے نوجوانوں کو نہ منزل ملتی ہے اور نہ ہی معاشرہ کا کامیاب انسان بنتے ہیں ایسے نوجوانوں کے لئے سید عامر رشید جیسی شخصیات بھی کسی رول مڈل سے کم نہیں کہ جنہوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سرکاری درسگاہوں جنہیں پیلے اسکول کے نام سے بھی جانا جاتا ہے سے تعلیم حاصل کی اور اپنی محنت سچی لگن جذبے سے آج سندھ حکومت کے بلدیاتی ادارے واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کراچی میں ایک اعلیٰ عہدے ڈائریکٹر اکاؤنٹس پر تعینات ہیں۔ سچ کہتے ہیں ناں کہ اگر لگن اور جذبہ سچا ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے، گزشتہ روز سید عامر رشید سے ''روزنامہ رفتار اور ہفت روزہ جیت میگزین'' کے قارئین کے لئے ایک تفصیلی نشست کا اہتمام کیا جس میں روٹین سے ہٹ کر انکی نجی زندگی بارے دوستوں سے میل ملاپ اور پیشہ وارانہ آمور پر گفتگو کی گئی جو پیش خدمت ہے۔

سوال: پہلے تو اپنی نجی زندگی اور خاندان کے پس منظر کے بارے بتائیں کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے آپ کی پیدائش کہاں ہوئی شادی کب کی؟

جواب: میرے والدین اور انکے خاندان انڈیا کے شہر گوالیار کے ہیں قیام پاکستان کے وقت سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ کر کراچی میں قیام پذیر ہو گئے۔ 1973 میں کراچی میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم اور بوائز سیکنڈری گورنمنٹ اسکول پاپوش ناظم آباد سے جسے پیلے اسکول کہتے ہیں میٹرک کیا بعدازاں جناح کالج میں میں نے ایڈمیشن لیا انٹر اور گریجویشن میں نے جناح کالج سے کیا ہم تین بھائی تھے ایک بھائی کے دل میں سوراخ ہونے کے باعث کم عمری میں انتقال کر گئے جبکہ دوسرا چھوٹا بھائی شعیب جو مجھ سے ایک ڈیڑھ سال چھوٹا تھا

اس کا سیاسی پارٹی سے تعلق تھا 17 سال عمر تھی 1991 میں اس کا قتل ہو گیا وہ دن ہمارے لیے بہت افسردہ اور دکھی دن تھا۔ کراچی پولیس کے نام ور مشہور شہید بہادر علی جو کزن بھی ہیں اور بہنوئی بھی ہیں انہوں نے مجھے پولیس میں بطور اے ایس آئی اپوائنٹمنٹ کرائی تھی اسی دن یہ حادثہ ہو گیا محکمہ پولیس جوائن نہ کر سکا۔ بعدازاں 17-10-1991 اسسٹنٹ اکاؤنٹس واٹر بورڈ جوائن کیا جذبے لگن کے ساتھ محنت کی آج ڈائریکٹر اکاؤنٹس میں انچارج ہوں۔ والدہ میری الحمداللہ حیات ہیں بہنیں ہیں ایک بہن جدہ میں ہے اسکے بچے ہیں۔ 2010 میں میری شادی ہوئی تھی اللہ پاک ایک بیٹی دی ہے چھوٹی سی میری فیملی ہے سوہنے رب نے اپنے گھر کی زیارت کرائی۔ 2014 میں عمرہ اور حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ حج کے بعد دنیا اور زندگی بڑی چینج ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو عنایتیں برکتیں ہیں نعمتیں ہیں وہ بڑھ جاتی ہیں اس میں ہمارے ادارے کا بہت بڑا رول ہے کیونکہ ہمارے چولہے ان سے جلتے ہیں اسے کہتے ہیں وفاداری اپنے ملک سے صرف نہیں اپنے اداروں سے بھی کرنی چاہیے۔

سوال: آپ اسسٹنٹ اکاؤنٹس بھرتی ہوئے، ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ڈائریکٹر اکاؤنٹس کی پوسٹ پر ہیں، بڑی ذمہ داری کی پوسٹ ہے۔ ادارے میں کوئی رول ماڈل ہے جس کو دیکھ کے اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں میں نکھار لائے۔

جواب: واٹر بورڈ میں منور حسین میرے ڈی ایم ڈی تھے، بڑا لمبا عرصہ رہے ہیں ان کے ساتھ میں نے

کام کیا اور بہت کچھ سیکھا اس کے بعد افسران چینج ہوتے گئے ہر آدمی مجھے سکھاتا گیا اسے نہیں معلوم کہ میں ان سے سیکھ رہا ہوں۔ آغا شفیق درانی جو آغا سراج درانی کے بھائی ہیں ان کے ساتھ میں نے چار سال کام کیا اور انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا اس آدمی نے مجھے پہلے تو ایک چیز سیکھائی کے میں کبھی تعصب نا کرو، مطلب کہ میں اردو بولنے والوں کا ساتھ نہ دو ہمیشہ انکا دست شفقت رہا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت تھی انکا دور تھا وہ ایک سندھی اسپیکنگ آفیسر تھے مگر وہ کمال کے انسان تھے۔ ڈی ایم ڈی کی پوسٹ پر عمران زیدی صاحب ہیں بہت ہی منجھے ہوئے با اخلاق آفیسر ہیں بہت زبردست انسان ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے جس نشست پر میں بیٹھا ہوں اس میں بڑے مسائل ہیں وہ بہت ہی قابل اور کول مائنڈ آدمی ہیں انسانیت اور زندگی گزارنا کا طریقہ کسے کہتے ہیں۔

سوال: اپنے بزنس میں بڑا اسکوپ ہے کوئی اپنا کاروبار بھی تو کر سکتے تھے سرکاری ملامت کا ہی راستہ کیوں اختیار کیا اس کی کوئی خاص وجہ اگر آپ سرکار نوکری نہ ہوتے تو کیا کرتے؟

جواب: میرا دماغ بزنس مائنڈ نہیں تھا پولیس فورس میں نوکری میرا شوق تھا مگر نصیب واٹر بورڈ میں لکھا تھا میرے دوست احباب اب بھی مجھے کہتے ہیں کہ تو پولیس والا لگتا ہے تمہیں تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔

شہید بہادر علی کی قابلیت اور بہادری کے چرچے تھے جسے دیکھ کر مجھے بھی پولیس میں بھرتی ہونے کا نہ صرف شوق بلکہ جنون تھا۔ ایس پی ملیر عرفان بہادر رشتے میں میرا بھانجا لگتا ہے عرفان بہادر ویسے تو مجھ سے چھوٹا ہے لیکن اچھا آدمی ہے اچھا کام کر رہا ہے جو اس کی جاب کے تقاضے ہیں جو اس کی جگہ کے تقاضے ہیں۔ جہاں پر وہ بیٹھا ہوا ہے وہ پورے کر رہا ہے اور بہت بہتر کام کر رہا ہے۔ آج کے جو لوگ ہیں میں آپ کو بتاؤں آپ تھوڑا پیچھے جائیں گے تو آپ کو آج کے اور پیچھے والے افسران میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ینگ لوگ ہیں عرفان بہادر اور ایک دو نام اور بھی ایسے ہیں یہ ایک نئی جنریشن ہے آپ نے پولیس کا انداز چینج کر دیا اپنے طریقے سے نچلے لیول تک آپ نے چینج کیا ہے جب آپ خود صحیح ہوں گے تو آپ کے نیچے کے لوگ بھی صحیح ہوں گے اب تھانوں میں بھی چینج آئی ہے تھانے کسی زمانے میں خوف کی علامت ہوا کرتے تھے وہ خوف اب ختم ہو گیا ہے آپ کو آج تھانے میں آنے سے ڈر نہیں لگتا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ سرکاری ملازمت میں بڑے فائدے، اچھی تنخواہ کے ساتھ ساتھ بڑی مراعات بھی ملتی ہیں آپ تو سرکاری ملازم وہ بھی واٹر بورڈ کے ترقی کے ساتھ زندگی گزارنے کے انداز بھی بدل جاتے ہیں بیگم صاحبہ تو بڑی ڈیمانڈ کرتی ہوں گی؟

جواب: الحمدللہ میری بیوی میری دوست ہے اگر آپ بیوی کو اپنا دوست بنالو گے تو آدھا مسئلہ ویسے ہی حل ہو جائے گا اور اگر آپ بیوی کو بیوی سمجھو گے تو مسئلہ حل نہیں ہوں گے وہ بہت زیادہ صابر ہے اس میں ایسی کوئی ہوس نام کی چیز نہیں ہے نہ کوئی غرور ہے وہ بہت زیادہ سادہ طبیعت کی مالک ہے۔ جیسے وہ پہلے تھی ویسے ہی وہ آج بھی ہے جسے کہتے ہیں کہ میں خوش نصیب ہوں اس معاملے میں کہ مجھے ایک اچھی جیون ساتھی ملی ہے۔

سوال: ہر آدمی کا ایک کیریر ہوتا ہے اور ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد کا شمار بھی ملک کی فینس شخصیات میں ہو وہ اس ملک اور قوم کا نام روشن کرے آپ اپنے بیٹی کو پڑھا لکھا کر کیا دیکھنا چاہتے ہی کیا فیوچر پلاننگ ہے؟

جواب: میں نے اپنی بیٹی کو دو ٹارگٹ دیے ہوئے ہیں کہ آپ نے سی ایس ایس کا کمیشن پاس کرنا ہے ابھی وہ چھٹی کلاس میں ہے صبح سات بجے سے لے کر رات کے آٹھ بجے تک وہ پڑھائی میں مصروف رہتی ہے آٹھ بجے وہ گھر واپس آتی ہے اور ایک آدھ گھنٹہ موبائل وغیرہ دیکھ کر کھانا کھا کر دس گیارہ بجے وہ سو جاتی ہے ہفتے اور اتوار کو بھی اگر کوئی ہوم ورک وہ مکمل کرتی ہیں میری خواہش ہے کہ جو میں نہیں کر سکا وہ میری بیٹی کرے اور جب وہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرے گی تو وہ پی ایس پی میں آفیسر بھرتی ہو گی اور میری بیگم بھی یہی چاہتی ہے کہ میری بیٹی پولیس افسر بنے آج کل کے زمانے میں ڈاکٹر بہت زیادہ پروفیشنل ہو گئے ہیں۔ پہلے کے زمانے میں جو ڈاکٹروں کی عزت ہوا کرتی تھیں اب وہ نہیں ہے وہ کمرشل ہو گئے ہیں جیسا کہ میں نے آپ کو کہا کہ پولیس نے اپنے آپ کو بہت بہتر کیا ہے پولیس میں مسئلے بہت زیادہ ہے پولیس میں ڈیوٹیاں بہت لمبی لمبی ہیں ان کی چھٹیاں نہیں ہیں۔ عید کے دن بھی کھڑے ہوتے ہیں اپنی فیملی کے مسائل حل نہیں کر پاتے وہ ایک ایندھن کا کام کر رہے ہیں اور ہم انہیں گالیاں دے رہے ہیں آپ ان کی شفٹ کم کریں 98 گھنٹے کی نوکری ہو ان کا میڈیکل پروپر ہو تو ان کو بھی آپ دیکھیں گے کہ یہ بہت اچھے طریقے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے

سوال: واٹر بورڈ ایک خود کفیل ادارہ ہے لگتا ایسا ہے کہ جان بوجھ کر افسر شاہی کی مصالحت پسندی کے باعث اسے تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ ملازمین اور کنٹریکٹرز بقایا جات کے لئے سراپا احتجاج رہتے ہیں آپ انہیں کیسے مینج کرتے ہیں، کیا نئے ایم ڈی صاحب کے آنے سے کوئی ادارہ میں بہتری کی راہیں ہموار ہوئی ہیں۔

جواب: مینج اللہ کراتا ہے ناراض وہ ہو گا جس کا کام نہیں ہو گا کہ وہ اتنا دور سے آیا اور اس کا کام بھی نہیں ہوا تو وہ تو آپ کو بددعائیں بھی دے گا ابھی ہمارے ایم ڈی اور جو سی ای او آئے ہیں وہ بہت زیادہ پوزیٹو ہیں۔ کوشش کر رہے ہیں آن لائن سسٹم جو بھی ایشوز ہیں جس کی وجہ سے بھی ہیں ان کو فوری ختم کیا جائے۔ ریکوری کو امپرومنٹ کی طرف لائے اس کے لیے اقدام کر رہے ہیں، میٹنگز کر رہے ہیں کیوں کہ مہنگائی ہر جگہ بڑی ہے تو آپ کے خرچے بھی بڑھے ہیں۔ ہمارے ادارے کے جو خرچے ہیں جس سے آپ کا شہر چل رہا ہے بجلی پیٹرول سب پیسے بڑھے ہیں تو ان کو بھی آپ نے مینی مائز کرنا ہے اور آپ کی آمدنی کتنی ہے اس کو آپ نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی کرنا ہے اور لائبلیٹی ایمپلائز کی جو ہے وہ بھی آپ نے نکالنی ہے اس کا آپ نے ماہانہ کا دس پندرہ کروڑ روپے نکالنا ہے جس میں سے 12 کروڑ روپے تو ماہانہ az ایمپلائز کی پیمنٹ ایک آدمی کا آنا اور فورا اقدامات کرنا یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ ظاہری بات ہے جو بھی آدمی کہیں اگر آئے گا تو اس جگہ کا پہلے مسئلہ دیکھے گا جائزہ لے گا اسے سمجھے گا اور پھر وہ حل کی طرف جائے گا ان کو ابھی ایک ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے میرا یہ خیال ہے کہ ان کو ابھی اور ٹائم دینا چاہیے وہ ایک اچھے افسر ہیں۔ لہٰذا ان کو ٹائم دینا چاہئے جیسا کہ آپ کہہ رہے تھے کہ کچھ لوگ ناراض بھی ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے بھی کوششیں کی جا رہی ہیں کے سب مسائل حل ہو جائیں اور انشاء اللہ جلدی ہنگامی بنیاد پر بھی حل ہوں گے اور اس کے بھی اقدامات اچھے طریقے سے ہو رہے ہیں

سوال: آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد فیوچر پلاننگ کے حوالے سے کیا سوچا ہے؟

جواب: میں گھومنے پھرنے اور ٹریولنگ کا شوقین آدمی ہوں۔ آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ مجھے جہاں موقع ملتا ہے میں نکل جاتا ہوں ٹریولنگ کرنے کے لئے ریٹائرمنٹ میں دس گیارہ سال رہ گئے ہیں اور جب میں ریٹائرڈ ہو جاؤں گا تو میری یہی کوشش ہے کہ میں لاہور یا اسلام آباد میں شفٹ ہو جاؤ اللہ نے چاہا تو جو میری پینشن ہو گی اس سے گھر کا کچن چل جائے گا۔ ریٹائرمنٹ پر جو پیسے ملیں گے وہ کہیں پر انویسٹ کر دیں گے۔ باقی زندگی ہی کیا رہ جائے گی گھومنے پھرنے لوگوں سے ملنے میں گزر جائے گی۔ گاؤں دیہات کے لوگوں کے رہن سہن انکے گزر بسر بارے مجھے بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ کچے مکانوں میں رہنے والوں کے کیا مسائل ہیں اور اگر اللہ نے مجھے چنا ہو گا تو وہاں ان کے مسئلے حل کروں گا۔ میرے دل کی خواہش ہے کہ میں جاؤ لوگوں کے گھروں میں اور جس کا کوئی مسئلہ ہے اس کو حل کرو جیسے کہ کسی کی شادی ہونی ہے تو ان کی جتنی ہو سکے مدد کرو یعنی کی خدمت خلق کرنا چاہتا ہوں اور سیاست میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

# کراچی کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کب ختم ہوگا؟

## شہر میں ٹرانسپورٹ کا نظام نہیں ہے، پبلک ٹرانسپورٹ تو عرصہ دراز سے ختم ہوچکی ہے، پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا بے ہنگم نظام چل رہا ہے

## کراچی؛ وہ گائے جو دودھ دیا کرتی تھی یہ گائے اب ذبح ہوچکی ہے اور سب نوچ نوچ کر اس کا گوشت کھا رہے ہیں

محمد عارف میمن/ امبر دانش

نئے ایڈمنسٹریٹر کراچی ڈاکٹر سیف الرحمٰن نے چارج سنبھال لیا ہے۔ جمعہ کو ان کا آفس میں پہلا دن تھا۔ وقت پر دفتر پہنچے اور فوری ایک اجلاس طلب کرلیا۔ جس میں خبروں کے مطابق سب سے پہلے کراچی کے شہریوں کیلیے عذاب بنے ہوئے پارکنگ مافیا سے متعلق احکامات جاری کیے اور کہا کہ فوری طور پر کراچی کے تمام پارکنگ کے ٹھیکے ختم کردیے جائیں اور جب تک نئے ٹھیکے الاٹ نہیں ہوتے تب تک کسی شہری سے پارکنگ فیس وصول نہ کی جائے۔ دوسرا فیصلہ کراچی کی سڑکوں کی استرکاری اور گرین بیلٹ کا تھا۔ نرسریوں سے پھول اور پودے لے کر سڑکوں کے کناروں پر لگائے جائیں تاکہ شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہو۔

کچھ نہ کرنے سے کچھ کرلینا بہتر ہے۔ کراچی کے زخموں کا علاج اس سے ممکن تو نہیں، مگر اس سے کراچی کے زخموں کو کچھ راحت ضرور ملے گی۔ نئے ایڈمنسٹریٹر کراچی، شہر قائد کیلیے مسیحا بن کر آئے ہیں یا پھر کراچی کو مزید زخم دینے , یہ فیصلہ وقت پر چھوڑتے ہیں۔ مگر آتے ہی جو انٹری دی ہے اس سے لگتا ہے کہ شاید کراچی کے زخموں کا علاج نہ سہی مگر کچھ مرہم پٹی کر کے کراچی کے شہریوں کو ٹھنڈک ضرور پہنچائی جائے گی۔

کراچی کو جس بے دردی سے نوچ نوچ کر کھایا گیا اور سیاسی اشرافیہ نے جس طرح اپنے محل بنائے، اس کا حساب کوئی بھی دینے کو تیار نہیں۔ عدلیہ کے سوموٹو ایکشن آج بھی سرکار کی ردی کی ٹوکریوں میں پڑے ہیں، جن پر آج تک عملدرآمد نہیں ہوسکا۔ چائنا کٹنگ کے حوالے سے سپریم کورٹ کے احکامات پر شروع کیا جانے والا آپریشن آج کمائی کا ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ کے خلاف دیے گئے فیصلے پر آج تک عملدرآمد نہیں ہوسکا۔ کراچی کی حلقہ بندیوں کو اپنی مرضی سے تتر بتر کردیا گیا، مگر کسی نے ایکشن نہیں لیا۔ کراچی کے لوگوں کو آج بھی پینے کا پانی میسر نہیں، خرید کر پیا جانے والا پانی ہمارا ہی ہے جو غیر مقامی لوگوں کے قبضے میں دیا ہوا ہے اور وہ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق فروخت کرتے ہیں۔

دنیا چاند سے آگے کی بات کر رہی ہے، روزنت نئی ٹیکنالوجیز ہمارا منہ چڑا رہی ہیں، مگر ہم کراچی والے آج بھی چندہ کر کے سیوریج لائنیں ڈلواتے ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت گلیوں کی صفائی کرتے ہیں، گراؤنڈ صاف کرواتے ہیں تاکہ ہمارے بچے کھیل سکیں۔ واٹر بورڈ کے افسران اپنی روزی روٹی میں جتے رہتے ہیں جنہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے، انہیں صرف اپنی ذات سے مطلب ہے۔ دنیا تیز ترین سواریوں میں جتی ہوئی ہے، روز کسی نہ کسی ملک سے تیز ترین سواریوں کی خبریں سامنے آتی ہیں، جب کہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کے تیسرے بڑے شہر کی جان آج بھی چنگ چی اور غیر معیاری لوکل مزدا کو چز ہیں۔ رکشوں کی بھرمار اتنی ہے کہ سڑکوں پر چلنا دوبھر ہوگیا ہے۔ مگر پھر بھی کراچی چل رہا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا آج تک کوئی نظام وضع نہیں ہوسکا۔ غیر مقامی لوگوں کے ہاتھوں کراچی کو روزانہ ذلیل کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی کراچی آنکھوں میں آنسوں لیے جی رہا ہے۔

ہمارے لوگوں کو اپاہج بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تاکہ امداد مل سکے۔ اور جب امداد مل جاتی ہے تو پھر وہ کہیں اور جا کر خرچ کی جاتی ہے لیکن پھر بھی کراچی خاموش ہے۔ کراچی کیلیے مختلف دسترخوان سجائے جاتے ہیں جہاں سے عزت دار خاندان جا کر اپنے پیٹ کے دوزخ کی آگ بجھاتا ہے، لیکن سرکار وہاں بھی پہنچ جاتی ہے اور اس میں بھی اپنا حصہ تلاش کرلیتی ہے۔

ہمارے لوگوں کو اپاہج بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تاکہ امداد مل سکے۔ اور جب امداد مل جاتی ہے تو پھر وہ کہیں اور جا کر خرچ کی جاتی ہے لیکن پھر بھی کراچی خاموش ہے۔ کراچی کیلیے مختلف دسترخوان سجائے جاتے ہیں جہاں سے عزت دار خاندان جا کر اپنے پیٹ کے دوزخ کی آگ بجھاتا ہے، لیکن سرکار وہاں بھی پہنچ جاتی ہے اور اس میں بھی اپنا حصہ تلاش کرلیتی ہے۔

ہمیں اندھیروں کی نذر کر کے اجالوں کی تلاش کرنے والے سیاستدان شاید یہ بھول رہے ہیں کہ کراچی بھی اپنے منہ میں زبان رکھتا ہے، جو بدقسمتی سے آج کل خاموش ہے۔ ہمارے بچوں کو پرائیوٹ اسکولوں کے حوالے کردیا گیا ہے، اور سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہیں ہماری جیبوں سے نکالی جارہی ہیں۔ کراچی یہ سب بھی دیکھ رہا ہے، مگر اس نے بھائی چارگی کی خاطر اپنے لب سی رکھے ہیں۔

''ہم کراچی کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں'' یہ ڈائیلاگ کراچی روزانہ سنتا ہے اور اب اس کے

دماغ کے رگیں پھٹنے کو آتی ہیں۔ پھلتا پھولتا دیکھنے والے ہی کراچی کو نوچ نوچ کر کھا گئے ہیں اور یہ ہی آج کراچی کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں۔ کراچی نے سب کو باری باری موقع دیا کہ آؤ مجھے سنبھال لو، میں گر رہا ہوں، میں مر رہا ہوں، میرے زخم ناسور ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر اس کی آواز پر کسی نے کان نہیں دھرے۔ سب نے اپنے اپنے حصے کی باریاں لیں اور چلتے بنے۔ کراچی کا کسی نے نہیں سوچا۔ کراچی کے لوگوں کو دیوار سے لگا کر انہیں بھکاری بنا دیا گیا۔ اس شہر کے پڑھے لکھے نوجوان آج بھی رائیڈر بنے ہوئے ہیں، ٹھیلا لگا رہے ہیں۔ یہ نوجوان جن کے ہاتھوں میں کراچی کی باگ ڈور ہونی چاہیے تھی، وہ آج پرائیوٹ اداروں میں پیون کی نوکریاں کر کے ان پڑھ لوگوں کی ٹیبلیں صاف کر رہے ہیں اور غیر مقامی افراد اس شہر کے اَن داتا بنے پھر رہے ہیں۔

کراچی کے اجڑنے کی داستان اتنی طویل نہیں جتنی بنا دی گئی۔ چند سال میں کراچی کا حلیہ بگاڑ کر رکھنے والے آج کراچی کو سنوارنے کی بات کر رہے ہیں۔ دنیا کے بڑے شہروں کی فہرست میں شامل کراچی کو غلاظت سے بھر دیا گیا۔ اس شہر کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دنیا گواہ ہے جب جب پاکستان کے کسی بھی حصے میں کوئی مصیبت آئی تو سب سے پہلے کراچی ہی مدد کے لیے آگے آیا۔ آج بھی کراچی سب سے زیادہ فنڈ دینے والا شہر ہے لیکن اس کے باوجود کراچی کو کرچی کرچی کیا گیا۔ کراچی کی صرف ایک مارکیٹ آج ٹیکس دینا بند کر دے تو پورے ملک کا نظام جام ہو سکتا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ اگر پورا کراچی ٹیکس دینا بند کر دے تو پاکستان کہاں کھڑا ہوگا؟

ہمارے استاد محترم کہا کرتے تھے کہ کراچی ایک دودھ دینے والی گائے ہے، جس کو چارہ اس غرض سے کھلاتے ہیں کہ بس اس کا دودھ پیا جا سکے۔ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں کاروباری سرگرمیاں اپنے عروج پر ہوا کرتی تھیں۔ بیرونی ممالک سے لوگ سرمایہ کاری کرنے کراچی آیا کرتے تھے اور لوگ اندرون ملک سے بھی روزی کے حصول کیلیے کراچی کا رخ کرتے۔ حالانکہ یہ زمانہ بھی زیادہ پرانا نہیں، کیونکہ پانی کی قلت تو اس وقت بھی اس شہر میں موجود تھی، بس فرق یہ ہے کہ اس وقت کراچی کے دس فیصد علاقوں میں پانی نہیں آتا تھا اور اب مشکل سے دس فیصد شہر میں پانی آتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے استاد محترم سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ہم نے پھر سے کراچی پر سوال کر ڈالا تو درد بھری آواز میں فرمایا، اب یہ گائے ذبح ہو چکی ہے اور سب نوچ نوچ کر اپنے حصے کا گوشت کھا رہے ہیں۔ یہ بات جیسے ہمارے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی کہ واقعی اب گوشت ہی کھایا جا رہا ہے، اسی گوشت پر چھینا جھپٹی چل رہی ہے۔

کسی بھی شہر کی معاشی ترقی تین چیزوں پر منحصر ہے؛ شہر کا انفرااسٹرکچر، جس میں سڑکوں کی تزئین و آرائش سرفہرست ہے، جدید اور سستا ٹرانسپورٹ سسٹم، اور امن و امان کی بہتر سہولیات، تاکہ کاروباری حضرات کو تجارتی سرگرمیوں میں کوء

**کراچی کے اجڑنے کی داستان اتنی طویل نہیں جتنی بنا دی گئی۔ چند سال میں کراچی کا حلیہ بگاڑ کر رکھنے والے آج کراچی کو سنوارنے کی بات کر رہے ہیں۔ دنیا کے بڑے شہروں کی فہرست میں شامل کراچی کو غلاظت سے بھر دیا گیا۔ اس شہر کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا**

رکاوٹ درپیش نہ ہو، ملازمین اور شہریوں کو آمدورفت میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شہر بھی ڈر و خوف کی فضا سے پاک ہو۔ شہر میں امن و امان کی صورتحال خراب ہونے کا براہ راست اثر تجارتی و کاروباری سرگرمیوں پر پڑتا ایک لازمی امر ہے، اسی طرح شہری سہولتوں کے فقدان سے سرمایہ کاری متاثر ہوتی ہے۔

لیکن اس شہر میں برسوں سے انفرااسٹرکچر پر کوئی

کام نہیں ہو سکا۔ سڑکوں کی حالت زار سب کے سامنے ہے، بالخصوص حالیہ بارشوں کے بعد تو

سڑکوں پر سفر تو درکنار، پیدل چلنا بھی محال ہو چکا ہے۔ 2001 سے 2010 تک جنرل پرویز مشرف کے دور میں نئے بلدیاتی نظام متعارف کرانے کے بعد شہر میں ترقیاتی کاموں کا آغاز ہوا اور واقعی کراچی میں انفرااسٹرکچر بنا۔ روڑ، انڈر بائے پاسز، پل اور عوامی پارک بنائے گئے لیکن 2010 کے بعد اسی انفرااسٹرکچر کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بلدیات و سندھ حکومت کی جانب سے بنے ہوئے انفرااسٹرکچر کی نگہداشت اور مینٹی ننس نہ ہونے سے آج زبوں حالی کا شکار ہے۔

شہر میں ٹرانسپورٹ کا نظام نہیں ہے، پبلک ٹرانسپورٹ تو عرصہ دراز سے ختم ہو چکی ہے، پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا بے ہنگم نظام چل رہا ہے۔ دنیا کے چھٹے بڑے شہر کو چنگچی رکشاؤں کے حوالے کر دیا گیا ہے، جو من پسند روٹ بنا کر شہر کو برباد کر رہا ہے۔ پرائیویٹ بس و منی بس مافیا اپنی مرضی کا کرایہ وصول کر کے شہریوں پر دہرا عذاب نازل کر رہے ہیں۔ ایک تو مہنگائی دوسرا ٹرانسپورٹ نظام سے محروم شہری مجبوراً اس مافیا کے ہاتھوں لٹ رہے ہیں۔

2007 میں مکمل ہونے والے K3 پانی کے منصوبے کے بعد کراچی میں گزشتہ 15 سال سے پانی کا کوئی منصوبہ نہیں بنا۔ اس دوران کراچی کی آبادی روزانہ کی بنیاد پر بڑھتی رہی۔ 2007 میں کراچی کیلیے شروع کیا جانے والا پانی منصوبہ K4 آج 15 سال گزر جانے کے باوجود التوا کا شکار ہے۔ 25 ارب روپے کا پروجیکٹ ایک سو پچاس ارب روپے تک پہنچ چکا ہے لیکن آج بھی اسی

حالت میں پڑا ہے۔ کراچی میں پانی کی شدید قلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت کراچی کی اکثریت پانی خرید کر استعمال کرتی ہے۔ شہر پر ٹینکرز مافیا کا راج ہے، کئی علاقوں میں تو دس دس سال سے پانی نلکوں میں نہیں آیا۔

20 سال میں شہر میں کوئی نئی سرکاری یونیورسٹی نہیں بنائی گئی۔ جو پہلے سے ہیں، وہاں بھی یہ نوبت آگئی ہے کہ اساتذہ کو تنخواہیں وقت پر نہ دیے جانے کی وجہ سے آئے دن اساتذہ بھی سراپائے احتجاج ہیں۔

دن دہاڑے اسلحے کے زور پر لٹنا اور ذرا سی مزاحمت پر قتل ہوجانا جیسے اس شہر میں معمول کی بات بن گئی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ان حالات میں یہ بیرونی ممالک اپنے کاروبار کیلیے کم از کم اس شہر کا رخ تو نہیں کرنا چاہیں گے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر گائے دودھ دیتی رہتی تو کیا زیادہ بہتر نہ تھا؟

ہر دور کے سیاست دان نے شہر کو ترقی دینے کا وعدہ کیا، لیکن حیرانی اس بات کی ہے کہ تمام تر وسائل ہونے کے باوجود مرکز، صوبائی و بلدیاتی حکومتیں اس شہر میں ترقیاتی کام نہ کراسکیں، گویا کوئی اُن دیکھی طاقت انہیں روکے بیٹھی ہو۔ ذرا سوچیے کہ قیام پاکستان سے اب تک کراچی کا ایک بھی ماسٹر پلان پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور شہر گندگی کا ڈھیر بنتا چلا گیا کہ پھر کچرا اٹھانے کیلیے بھی چین سے مدد لینے کی ضرورت آن پڑی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی سدھار کی امید باقی ہے؟ اور کس سے امید کی جاسکتی ہے؟

بھٹو کے زمانے سے جب بھی پاکستان میں جمہوری نظام قائم ہوا تو ایک ہی جماعت نے سندھ پر راج کیا۔ لیکن کراچی میں جہاں برٹش راج سے ستر کی دہائی تک ٹرامز چلا کرتی تھیں اور ملک کا واحد سرکلر ریلوے سسٹم موجود تھا، وہ بھی بند کردیا گیا۔ پرویز مشرف کے لائے گئے بلدیاتی نظام اور کچھ حد تک شہر میں اس کی ذاتی دلچسپی نے شہر کی حالت کچھ عرصہ بہتر ضرور ہونے دی لیکن پچھلے پندرہ سال سے اس شہر کا سفر پستی کی جانب گامزن ہے جس کا سہرا پوری طرح موجودہ صوبائی حکومت اور اس کے اتحادیوں کے سر ہے۔

تبدیلی سرکار کے دعوے بھی دعوے ہی رہے، اس شہر کیلیے پہلے 65 ارب اور پھر گیارہ سو ارب کے ہوائی پیکیج کے اعلان کے علاوہ کوئی کام نہ کرسکی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات مزید عیاں ہوگئی کہ کراچی کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں انہیں کوئی خاص شغف تھا بھی نہیں۔ پونے چار سال کے دوران وفاق کی جانب سے ایک ممبر قومی اسمبلی کو ایک ارب سے زیادہ کی رقم جاری کی گئی لیکن چودہ ارکان اسمبلی نے یہ اربوں روپے کہاں کھپائے اس کی تفصیلات جاننے سے عوام محروم ہیں۔

شہری سندھ میں مہاجروں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار سیاسی جماعت جو کہ اب مختلف گروہوں میں تقسیم ہوکر مزید سکڑ چکی ہے، جس کی وجہ شہرت عوام کے درمیان اتر نا تھی، آج عوام ہی سے بیگانے ہوکر تباہی کے دوراہے پر آچکی ہے۔ رہی سہی کسر صوبائی حکومت، جس کی کارکردگی سے عوام پہلے ہی نالاں تھے، ان کا اتحادی بن کر پوری کردی۔

آج بھی یہ تمام سیاست دان اس شہر کی زبوں حالی پر ماتم کناں ہونے کے بجائے آپس کی ''سیٹلمنٹ'' میں مشغول ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے جیسے کل نہیں آنے والی، لہٰذا جو حاصل کرنا ہے ابھی کرلیا جائے۔ کیونکہ اب گائے کا دودھ تو ملے گا نہیں، لہٰذا جتنا گوشت بٹور لیا جائے اتنا اچھا ہے۔

اور عوام؟ اس کا حال اس سہمے ہوئے میمنے کی طرح ہے جو اپنی آنکھوں سے گائے ذبح ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ لہٰذا کراچی کے عوام نے تو چپ ہی رہنا ہے۔ اپنے حق کیلیے آواز اٹھائی تو آواز بند ہوجانے کا اندیشہ ہے اور اپنے پیچھے پریشان رہ جانے والے بیوی، بچوں کی کفالت کا خوف اسے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف سر اٹھانے کی اجازت ویسے بھی نہیں دیتا۔ اور وہ یاد کرتا ہے کہ جس شہر میں پانی بھی وہ اپنی جیب سے خرید کر پیتا ہو، وہاں اس کے پیچھے روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ پانی کا بندوبست کیسے ہوگا؟ یا پھر کسی امیرزادے کے ہاتھوں دنیا سے چلے جانے پر خون معافی کے نام پر شاید گھر والوں کو کچھ مل جائے ورنہ جان کی امان اسی میں ہے کہ انسان شرافت سے چپ سادھ کر زندگی گزارے اور اگر راہ چلتے کوئی موبائل فون یا قیمتی اشیا لوٹنے کی کوشش کرے (جو کہ مشکل ہی اس کے پاس سے برآمد ہو) وہ فوراً لٹیروں کو بغیر مزاحمت کے دے دے۔ اور شکر کرے کہ جان و عزت بخشی ہوگئی۔

کراچی کو تعلیم چاہیے، کراچی کو پینے کا صاف پانی چاہیے، کراچی کو بہتر سڑکیں چاہئیں، کراچی کو ٹرانسپورٹ کا ایک معقول نظام چاہیے۔ کراچی آپ سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔ کراچی اپنے لوگوں کیلیے بہتر روزگار چاہتا ہے۔ کراچی پاکستان کا مستقبل ہے، اسے سرراہ رسوا کرنے کے بجائے اسے اس کا حق دو۔ کراچی چاہتا ہے کہ دنیا بھر سے لوگ اسے دیکھنے آئیں، اس کی خوبصورتی پر کتابیں لکھیں۔ کراچی چاہتا ہے کہ اسے اندھیروں سے نکال کر اجالوں کی طرف لایا جائے، کراچی چاہتا ہے اسے غیر مقامی اور غیر ملکیوں کے ہاتھوں رسوا نہ کیا جائے۔ کراچی چاہتا ہے اس پر حکمرانی کرنے والا کراچی سے ہو، جو اس کا دکھ درد سمجھ سکے۔ کراچی چاہتا ہے کہ یہاں قانون نافذ کرنے والے اس کے اپنے ہوں تاکہ فوری انصاف میسر ہوسکے۔ یہ سب کراچی کا حق ہے جو اسے ملنا چاہیے۔

کراچی زیادہ کچھ نہیں مانگ رہا، بلکہ وہ مانگ رہا ہے جو دیگر شہروں کو اول روز سے میسر ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کب ختم ہوگا؟ کراچی امید کرتا ہے کہ نیا ایڈمنسٹریٹر اس کے دکھ درد سمجھتے ہوئے اس کے زخم بھرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

آپ عوام کا پانی عوام کو فروخت کرنا چاہتے ہیں تو

آپ کیلیے کراچی بہترین چوائس ہے، آپ شہریوں کی جگہ پر ان کی گاڑی کھڑی کرنے کے پیسے وصول کرنا چاہتے ہیں تو اس حوالے سے بھی کراچی ہی کا نام آپ کے دماغ میں گونجے گا۔ اگر آپ بچت بازار لگانے کے خواہشمند ہیں اور زمین میسر نہیں، تو گھبرانے کی ضرورت نہیں، کراچی میں آپ کسی بھی گراؤنڈ پر یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں، کوئی نہیں پوچھے گا۔ بس جیب گرم ہونی چاہیے۔ اگر آپ لوگوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں اور آپ ڈاکٹر بھی نہیں، تو پریشان مت ہوں، کراچی ہے نا۔ آپ بنا کسی محنت کے بس ایک پستول دکھا کر پیسہ کمانا چاہتے ہیں تو بھی کراچی آپ کیلیے ایک محفوظ جگہ ثابت ہوگی۔ آپ یہاں آ کر یہ کام با آسانی کر سکتے ہیں۔ آپ پاکستان کے شہری نہیں اور آپ کراچی میں رہنا چاہتے ہیں، تو آپ بے فکر ہو کر کراچی آجائیے، یہاں آپ سے کوئی بھی شناخت نہیں مانگے گا۔ بس جیب میں نوٹ ضرور ہونے چاہئیں۔

کراچی پر جہاں ہر طرح کے عذاب مسلط ہیں وہیں آج کل پارکنگ مافیا بھی اپنے کام میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ پارکنگ مافیا میں کام کرنے والوں میں یقیناً کراچی کا کوئی بھی شہری موجود نہیں، اس میں جتنے بھی لوگ رکھے گئے ہیں

وہ سب کراچی سے باہر کے ہیں، جنہیں بات کرنے کی تمیز تک نہیں۔ یہ لوگ کراچی کے شہریوں کو دن رات لوٹنے میں مصروف ہیں، مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جگہ جگہ پارکنگ مافیا متعلقہ اداروں کو نظر نہیں آتی۔ صدر موبائل مارکیٹ میں موٹر سائیکل پارکنگ 30 روپے کر دی گئی ہے۔ ایک لائن کے بجائے تین تین لائن لگا کر لوگوں سے روزانہ کی بنیاد پر لاکھوں روپے بٹورے جا رہے ہیں۔ کوئی پارکنگ دینے سے انکار کر دے تو اس کی بائیک لفٹر کے ذریعے اٹھالی جاتی ہے جہاں واپسی کیلیے تین سو روپے کے بجائے سات سو روپے وصولی کا ایک الگ قانون بنا ہوا ہے۔

کراچی کی پارکنگ مافیا اتنی مضبوط ہے کہ آپ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ شور شرابا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کراچی میں چند ایک کے سوا باقی تمام پارکنگ ایریاز غیر قانونی ہیں، مگر یہ قانون کی آنکھوں کے سامنے قائم بھی ہیں اور ترقی بھی کر رہے ہیں۔ کراچی دنیا کا واحد میگا سٹی ہے جہاں کی اپنی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے، باقی دو کروڑ آبادی کراچی سے باہر کے لوگوں کی ہے۔ اس میگا سٹی میں کراچی والوں کیلیے کوئی سہولت نہیں، جو باہر والوں کو دستیاب ہے۔ جس میں سب سے بڑی سہولت سرکاری نوکری کی ہے۔ اگر آپ کراچی کے پیدائشی ہیں تو آپ کا سرکاری نوکری پر کوئی حق نہیں۔ یہ حق باہر والوں کیلیے رکھا گیا ہے۔ آپ کراچی میں رہتے ہیں تو آپ کو پانی کے لیے بوند بوند کو ترسنا ہوگا، کیوں کہ اس پر باہر سے آنے والوں کا قبضہ ہے۔ آپ کو پانی کیلیے واٹر ٹینکرز مافیا کی منتیں کرنی ہوں گی اور ان کے منہ مانگے دام پر پانی لینا ہوگا۔ اس کی بڑی وجہ یہاں قانون نہیں جو چیک اینڈ بیلنس رکھے۔

کراچی پر ایک عذاب کے الیکٹرک بھی ہے جو ماہانہ بل ادا نہ کرنے پر فوری طور پر آپ کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے، مگر بل بھرنے کے بعد آپ کی شکایت سننے کیلیے آپ کو اس کے دفتر کے دھکے کھانے ہوں گے اور وہاں بھی مرضی انہی کی چلے گی آپ کی نہیں۔ سردیوں کا موسم آچکا ہے، بجلی کی ضرورت میں کمی بھی واقع ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ تا حال موجود ہے۔ اس پر کمپلین کرنے پر آپ کو رٹا ہوا جواب ملتا ہے کہ ٹیکنیکل فالٹ ہے، جس پر کام ہو رہا ہے۔ اور یہ ٹیکنیکل فالٹ ایسا ہوتا ہے کہ سالہا سال ختم نہیں ہوتا۔

کراچی والوں پر تفریحی جگہوں پر جانے پر ایک قسم کی پابندی ہے۔ کیوں کہ وہاں بھی غیروں کا قبضہ ہے۔ آپ کراچی کی کسی بھی تفریحی جگہ پر چلے جائیں جہاں گورنمنٹ نے داخلہ فری کر رکھا ہے لیکن وہاں بیٹھا ایک شخص آپ سے زبردستی ٹکٹ

وصول کرے گا، بائیک کی پارکنگ الگ سے ادا کرنی ہوگی۔ بیگ چیک اس لیے ہوں گے کہ آپ کھانے پینے کی اشیا نہیں لے جا سکتے کیوں کہ اندر اسٹال موجود ہیں جہاں سے آپ مضر صحت چیزیں خرید کر کھائیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ کو داخلہ نہیں دیا جائے گا۔ یہاں پر موجود لوگ اگر آپ دیکھیں تو یقیناً ان کے پاس شناختی کارڈ تک موجود نہیں ہوں گے۔

ٹریفک پولیس بھی کراچی والوں کیلیے عذاب سے کم نہیں۔ اس میں بھی مقامی پولیس اہلکار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ٹریفک پولیس کا کام ٹریفک کلیئر کرنا نہیں، ان کا کام صرف میلہ لگا کر موٹر سائیکل سواروں کو لوٹنا ہے۔ بدترین ٹریفک جام ہوگا لیکن ٹریفک پولیس کا دھیان اس کے بجائے بغیر ہیلمٹ والے موٹر سائیکل کی طرف ہوگا۔ یا پھر ایسی سوزوکی پر نظریں ہوں گی جو لوڈ ہو کر جا رہی ہوگی۔ جگہ جگہ میلہ لگا کر کھڑے ہونے والے یہ ٹریفک پولیس اہلکار صبح گھر سے خالی جیب نکلتے ہیں، مگر جب شام کو ان کی واپسی ہوتی ہے تو چہرے خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ سب سے بڑی مثال ٹاور اور آرٹس کونسل پر لگنے والے میلے کی ہے، جہاں رات کو بارہ بجے بھی یہ سلسلہ چل رہا ہوتا ہے۔

کراچی والے ان عذابوں کے ساتھ تو جی ہی رہے ہیں مگر آج کل کراچی والوں پر ایک نیا عذاب کھلوں کے گراؤنڈز میں بچت بازاروں کی بھرمار ہے جہاں اشیائے خورونوش کی قیمتیں مارکیٹ سے ڈبل قیمت پر مل رہی ہیں، جہاں کوئی چیکنگ والا نہیں۔ تھانے اور ڈی سی آفس کی سیٹنگ سے چلنے والے ان بچت بازاروں میں فی اسٹال پانچ سو روپے اور فی ٹھیلہ تین سو روپے چارج کیا جاتا ہے۔ جہاں سے روزانہ لاکھوں روپے وصول کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی ہمارا قانون بے بس ہے۔ ان کے پاس اجازت نامہ نہ ہونے کے باوجود یہ لوگ بدمعاشی کے ساتھ گراؤنڈز پر بچت بازار لگا رہے ہیں۔ ضلع کیماڑی اور بلدیہ ٹاؤن اس حوالے سے بہت مشہور ہیں جہاں کوئی ایسا گراؤنڈ نہیں جہاں پر بچت بازار نہ چل رہے ہوں۔ ان سے وصولی کرنے والا بھی مقامی نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں بھی قانون بے بس ہے۔ ضلع کیماڑی میں ہی ہم نے واٹر بورڈ کی مین لائنوں میں ہیوی جنریٹر فٹ ہوتے دیکھے، جنہیں روکنے والا اس روئے زمین پر کوئی نہیں۔

ضلع کیماڑی میں ہی بس ٹرمینل کے ساتھ اسمگلنگ کا سامان بلاخوف وخطر بک رہا ہے، اور فروخت کرنے والے بھی آپ کو پاکستانی نہیں بلکہ دوسرے ملک کے شہری ملیں گے۔ لیکن آپ ان سے بحث نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان کی طاقت آپ کی طاقت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اسی طرح کراچی کی پبلک ٹرانسپورٹ کا حال دیکھ لیجئے، جن کے پاس شناختی کارڈ تک موجود نہیں وہ لوگ ڈرائیور اور کنڈیکٹرز ملیں گے۔ یہ خواتین و بزرگوں سے بدتمیزی اور ہتک آمیز سلوک روا رکھتے ہیں، لیکن کسی میں ہمت نہیں کہ وہ ان پر ہاتھ ڈال سکے۔ اللہ اللہ کر کے سندھ گورنمنٹ نے بجلی سے چلنے والی بسوں کو سڑکوں پر لانے کا فیصلہ کیا ہے، لیکن اسے ناکام بنانے کیلیے پبلک ٹرانسپورٹ مافیا نے یقیناً پلان بھی پہلے ہی بنالیا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے رہتے ہوئے کراچی میں کوئی دوسری سروس آج تک کامیاب نہیں ہو سکی۔

# پاکستان کا سیاسی اور خارجی ماحول

## اس وقت پاکستان اپنے حساس ترین دور سے گزر رہا ہے

**جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ امریکا کے پاکستان کے اوپر تحفظات ہیں**

**حالیہ امریکی بیان کا بنیادی مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستان کے جوہری پروگرام پر کسی قسم کی پابندی لگوائیں**

ڈاکٹر زمرد اعوان

اس وقت پاکستان اپنے حساس ترین دور سے گزر رہا ہے۔ کیلی فورنیا میں ڈیموکریٹک پارٹی کی ایک تقریب کے دوران 13 اکتوبر 2022 کو امریکی صدر جو بائیڈن نے امریکی خارجہ پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''میرے خیال میں پاکستان دنیا کی خطرناک ترین قوموں میں سے ایک ہے اور پاکستان کے جوہری پروگرام پر بہت سے سوالات ہیں''۔ یعنی کہ یہ پروگرام امریکا کی نظر میں محفوظ نہیں ہے۔

امریکی صدر کے اس بیان کا جائزہ لینے کیلئے اس تقریر کے سیاق وسباق سے آگاہی ضروری ہے۔ دراصل صدر بائیڈن نے ان خیالات کا اظہار دنیا کو درپیش عالمی سیاسی خدشات کا جائزہ پیش کرتے وقت کیا۔ جس میں پہلے انہوں نے روس اور چین پر تنقید کی اور پھر پاکستان کے جوہری پروگرام پر عدم تحفظ کا اظہار کیا۔ امریکا کا بنیادی مقصد پاکستان کو چین سے پرے ہٹانا اور امریکا پر اس کا اں حصار بڑھانا ہے، جو پاکستان کے مفادات اور قومی سلامتی سے متضاد ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں امریکا پاکستان کو براہ راست تو اپنے زیر سایہ نہیں رکھ سکتا، اس کیلئے وہ مشرق وسطی کے ممالک کو آگے لاتا ہے۔ اس وقت امریکا یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان میں سیاسی اور اقتصادی عدم استحکام کے ساتھ ساتھ اداروں کی باہمی چپقلش ایک بہترین موقع ہے پاکستان کے اوپر دباؤ بڑھانے کا۔ مزید یہ کہ، پاکستان میں حالیہ اندرونی افراتفری اور زرمبادلہ کا خسارہ، بیرونی طاقتوں کو ہر طرح کی دخل اندازی کیلئے سازگار حالات فراہم کررہے ہیں۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ امریکا کے پاکستان کے اوپر تحفظات ہیں۔ یہاں ہم پاکستان امریکا کے تعلقات کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک سرد جنگ کا دور تھا جو پاکستان اور امریکا نے مشترکہ ضروریات کی بنا پر سیٹو اور سینٹو کے ذریعے اتحاد قائم کیا۔ لیکن اس وقت 1950 کی دہائی میں پاکستانی حکمرانوں کو اس کا صلہ جاتا ہے کہ انہوں نے اتحاد

میں ہونے کے باوجود چین کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کیے۔ پاکستانی سیاستدانوں نے تب ہی سمجھ لیا تھا کہ چین ایک ابھرتی ہوئی طاقت اور ہمارا پڑوسی ملک ہے، اس لیے ہمیں اپنے باہمی تعلقات کو مضبوط کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ خاص طور پر آگے چل کر 1970 کی دہائی میں، ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پاک چین تعلقات میں مزید بہتری آئی۔ اس وقت بھی امریکا خوش نہیں تھا لیکن ہم نے یہ ثابت کیا کہ ہم چین کے ساتھ تعلقات کسی صورت خراب نہیں ہونے دیں گے۔ حالانکہ پاکستان کے ہر ادارے میں ہمیشہ سے ایسے گروہ موجود رہے ہیں، جن کی ہمدردیاں امریکا کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ گروہ ان معاملات میں نہ صرف متحرک بلکہ مضبوط بھی ہیں۔

حالیہ امریکی بیان کا بنیادی مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستان کے جوہری پروگرام پر کسی قسم کی پابندی لگوائیں، یعنی اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے ذریعے سرپرستی کروائیں۔ وقتی طور پر پاکستان کو معاشی مسائل سے چھٹکارا دلوانے کیلئے، امریکا آئی ایم ایف اور دوسرے مالیاتی اداروں کی مدد سے پاکستان کو مزید قرضوں میں جکڑ بھی سکتا ہے۔ کمزور اور مفاد پرست پاکستانی حکمران آسانی سے امریکا کے اس جال میں پھنس سکتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ امریکا کی افغانستان میں کمزور گرفت، اسے دوسری علاقائی مواقع ڈھونڈنے پر مجبور کررہی ہے۔

امریکا کی اس قسم کی منصوبہ بندی اس لیے بھی ہے کہ افغانستان میں 20 سال رہنے کے باوجود اسے بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ اس

کے پاس جدید ترین ہتھیار اور سراغ رسانی کے ذرائع بھی موجود تھے۔ امریکا نے نہ صرف اپنے ٹیکس دہندگان کا پیسہ افغانستان میں ایک ''غیر ضروری'' جنگ لڑنے کیلئے استعمال کیا بلکہ خود کو سپر پاور کہنے کے باوجود بھی اس میں ناکام رہا ہے اور وہ بھی اپنے سے انتہائی کمزور تربیت یافتہ اور تقریباً غیر مسلح افغانیوں کے مقابلے میں۔ اس صورت حال میں، کسی نہ کسی کو امریکا نے اپنی خفت مٹانے کیلئے مورد الزام قرار دینا ہی تھا، اور پاکستان پر الزام لگانا قدرے آسان تھا۔

پاکستان کو بھی یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امریکا اس خطے میں بھارت کو اپنا اسٹریٹجک اتحادی چن چکا ہے اور اسی وجہ سے خطے میں کواڈ (QUAD) اور آئی ٹو یو ٹو (I2U2) اتحاد میں دونوں ممالک شامل ہیں۔ جس کا بنیادی مقصد چین کے خلاف مشترکہ معاشی اور دفاعی حکمت عملی بنانا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کو اپنے دفاعی اور اقتصادی مفادات کیلئے، چین ہی کے ساتھ چلنا ہوگا۔ البتہ اتحاد کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ دوسرے ممالک کے ساتھ برے تعلقات قائم کرلیں۔ مثال کے طور پر اتحادی نہ ہوتے ہوئے بھی چین کی بھارت اور امریکا کے ساتھ تجارت کا حجم کافی نمایاں ہے۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی ملک معاشی ترقی اور اداروں کی مضبوطی کے لحاظ سے مستحکم ہے تو دوسرے منفی علاقائی رجحات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر آپ کی اقتصادی

حالت مخدوش ہو اور بیرونی مالی امداد ہی آخری امید بن جائے، تو پھر آپ اپنی حقیقی آزادی سے بہت دور ہوتے جائیں گے۔

اس ساری بحث میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب تک کسی ایک سیاسی جماعت کو اپنی مدت پوری کرکے انتخابات کے ذریعے تبدیل کرنے کے بجائے بیرونی سازش کی ایما پر تبدیل کیا جاتا رہے گا، تب تک سیاسی استحکام نہیں آسکتا۔ جس کی وجہ سے اقتصادی بحران بھی پیدا ہوجاتا ہے، جیسا کہ ہم آج پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جس طرح سابقہ وزیراعظم نے مطالبہ کیا کہ فوری شفاف اور آزاد انتخابات ہی ہمارے مسائل کا حل ہیں، عوام کی مرضی سے فیصلہ ہونا چاہیے، جس سے سیاسی استحکام آئے گا اور پھر ہی ہم معاشی حالات بھی بہتر کرسکتے ہیں۔

اس وقت پاکستان اپنے حساس ترین دور سے گزر رہا ہے، جس کیلئے ایک جامع مالیاتی اور خارجہ پالیسی کی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ مالی طور پر کسی بھی ملک پر انحصار کرنے کے بجائے اسے اندر سے وسائل پیدا کرنے کو فوقیت دینی چاہیے۔ آئی ایم ایف کا بیل آؤٹ پیکیج یا کسی دوسرے ملک سے مالی امداد ہمیشہ ایک عارضی حل ہوتا ہے، جو کہ آپ کو قومی معاملات پر سمجھوتے پر مجبور کرتا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کیلئے بہترین حکمت عملی یہ ہوگی کہ وہ دوست ہمسایہ ممالک جن میں چین، ایران اور ترکی پیش پیش ہیں، کے ساتھ اتحاد قائم کرے۔ یہ تعلقات بالآخر پاکستان کو امریکا اور دیگر بین الاقوامی مالیاتی ایجنسیوں پر انحصار سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔

آخر میں یہ جاننا ضروری ہے کہ مالیاتی بحران سے بچنے اور قومی مفاد پر مبنی خارجہ پالیسی کے حصول کیلئے پہلے ہمیں انتخابات کا اعلان کرکے سیاسی استحکام کو ممکن بنانا ہوگا۔ جس سے اقتصادی بحران بھی دور ہوگا۔ جو جماعت بھی جیتے، اسے پانچ سال کی مدت پوری کرنے دی جائے، تاکہ ایک دیرپا حکومت مستحکم معاشرے کو وجود میں لاسکے۔

# احساس کی آلودگی، ایک اہم معاشرتی مسئلہ

یہ آلودگی ہمارے اخلاقی زوال کا نتیجہ ہے

آج کل ہر طرف ماحولیاتی آلودگی اور اس کے اثرات کا شور ہے کہ فضائی آلودگی، پانی کی آلودگی، زمینی آلودگی، شور کی آلودگی، اور یہ کیسے کنٹرول ہوسکتی ہے وغیرہ۔ لیکن آلودگی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کا شور تو شاید سب سے زیادہ ہے لیکن ہم اس سے بالکل انجان بنے بیٹھے ہیں، حالانکہ اس کے مکمل ذمے دار ہم ہی ہیں، اور وہ ہے احساس کی آلودگی۔

اس آلودگی کا چرچا ہر روز پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر ہوتا ہے، لیکن ہم چونکہ اپنا بینک بیلنس بھرنے میں اس حد تک مصروف ہو چکے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جو کہ ہماری بنیاد ہیں۔

مادہ پرستی کے اس دور میں ہم ہر چیز کو پیسے سے تولتے ہیں، بے شک روپیہ پیسہ بہت کچھ ہے، لیکن سب کچھ نہیں۔ اس بہت کچھ کو حاصل کرنے کے چکر میں ہم سب کچھ بھلا بیٹھے ہیں۔ وہ سب کچھ کیا ہے، وہ ہمارے رشتے ہیں، کچھ خون کے، کچھ برادری کے، کچھ محلے داری کے، کچھ نسبت کے، کچھ اسلام کے، لیکن ہم ہر چیز سے نابلد ہیں۔ بیٹے نے والدہ پر ہاتھ اٹھا دیا، کبھی بیوی کی وجہ سے، کبھی کھانا لیٹ دینے پر۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، کوئی جائیداد میں اپنی بہن کا حصہ دبائے بیٹھا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اس سب سے ہم کیسے باہر نکلیں گے؟ آخر کب تک یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا؟ بڑا آسان سا سوال ہے اور اس کا جواب بھی ویسے تو بہت آسان ہے، لیکن ہم اس کا جواب تلاش کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم کہتے ہیں، جو جیسے ہے ویسا ہی چلتا رہے، بلکہ جو جیسے ہے وہ ویسے نہ چلے بلکہ ہماری مرضی سے چلے۔ ہم تو ایسے مذہب کے ماننے والے ہیں جس میں کسی کو اچھی راہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ وہاں رشتوں کے تقدس کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔

قرآن کہتا ہے 'والدین کو اف تک نہ کہو'۔ لیکن ہم اپنی انا میں اپنے حقوق کی جنگ لڑنے روز سڑکوں پر نکلتے ہیں، فرائض کی بات کون کرے۔ حضور کی حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرو، اپنے بھائی کیلئے بھی وہی پسند کرو۔ لیکن ایسا کون کرے، سب کو اپنی تجوری پسند ہے۔

شوہر کی تعظیم کیلئے یہاں تک بات کی گئی کہ اگر اللہ کے بعد کسی کو سجدہ کا حکم ہوتا تو بیوی کو حکم دیا جاتا وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ شوہر کو تلقین کی گئی کو وہ روپیہ پیسہ جو وہ اپنی بیوی پر لگائے گا وہ بھی صدقہ میں شمار ہوگا۔ آج کل شاید ہی کسی کی ایسی سوچ ہو۔ ہمسائیوں کی بات کریں تو اسلام نے اتنی تاکید کی (حدیث کے مفہوم کی روشنی میں) اگر کوئی سالن پکاؤ تو شوربہ زیادہ کرلو اور ہمسائے کے گھر بھی سالن بھیجو۔ آج کون ایسا کرتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔

تو پھر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہم احساس کی آلودگی سے آلودہ معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ یہ آلودگی ہماری اسی فرسودہ سوچ، لالچی طبیعت کا نتیجہ ہے۔ ہم اگر دینِ اسلام کی ان نصیحتوں پر عمل پیرا ہوجائیں جن میں ہمارے فرائض کی بات کی گئی ہے تو یقین مانیے ہم سب کے حقوق بالکل سیدھے ہوجائیں گے۔ اللہ پاک ہم سب کو اسلام پر کاربند رہنے کی ہمت اور توفیق دے، آمین۔

# صرف گھڑی ہی کیوں؟

**توشہ خانہ کی بیچی گئی گھڑی عمران خان کے لیے سوہانِ روح بن چکی ہے۔توشہ خانہ سے مستفید ہونے والے تمام افراد کا احتساب کیا جانا چاہیے۔**

**مستقبل کے حوالے سے ایسی قانون سازی کی جانی چاہیے کہ سربراہ مملکت کو ملنے والے تحائف گھروں کو لے جانے کا سلسلہ بند ہو جائے**

محمد عمران چوہدری

کہا جاتا ہے کہ ایک نئے نویلے جعلی پیر صاحب اس وقت پریشان ہوگئے جب انہیں پہلا بکرا ہڑپ کرنے کے بعد اپنے اندر سے بکرے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ پہلے پہل تو انہوں نے اسے اپنا وہم گردانا مگر جب یہ سلسلہ طویل ہوا تو انہوں نے اپنے شعبے کے پرانے لوگوں سے رابطہ کیا تاکہ اس مسئلے کو حل کیا جاسکے۔ ایک زیرک اور دانا پرانے جعلی پیر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے مرید کو بکرا واپس کردیں۔

''مگر اس سے میری بے عزتی ہوگی۔'' انہوں نے سوال کیا۔

''یہ تو ہے مگر بکرے کی بیں بیں بند کرنے کا اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار بھی تو نہیں۔''

''پیر صاحب کوئی محفوظ راستہ نکالیں۔'' وہ ملتمس ہوئے۔ گرو جی نے کافی سوچ بچار کے بعد مسئلہ کچھ اس طرح حل کیا کہ مرید کو بطور ہدیہ بکرا واپس کروادیا۔ اس طرح بکرا بھی واپس ہوگیا اور عزت بھی رہ گئی۔ بکرا واپس کرنے کے بعد انہوں نے گرو جی سے سوال کیا کہ حضور آپ تو اکثر بکرے کھاتے ہیں مگر آپ کے اندر سے آوازیں کیوں نہیں آتیں؟ انہوں نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ ہمیں عادت ہوچکی، ہم اکثر کھاتے رہتے ہیں جبکہ تم ابھی نئے ہو۔

کچھ ایسی ہی صورت حال عمران خان کے ساتھ بھی ہے، جنہوں نے قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے گھڑی بیچی مگر اب یہ گھڑی ان کیلیے سوہان روح بن چکی ہے۔ عین ممکن ہے انہوں نے اپنے اخراجات پورے کرنے کیلیے کرپشن کرنے کے بجائے ایسا کیا ہو۔ کیونکہ وہ برملا اس بات کا اظہار کرچکے تھے مہنگائی اس قدر زیادہ ہے کہ دو لاکھ تنخواہ میں ان کا گزارا نہیں ہوتا۔

ایسا گمان اس لیے بھی کیا جاسکتا ہے کہ آج کل ان کے حامی گھڑی کا دفاع کچھ اس طرح سے کررہے ہیں ''گھڑی بیچی ہے، قومی دولت نہیں لوٹی''، ''گھڑی بیچی ہے، تعلیمی امداد تو نہیں کھائی''، ''گھڑی بیچی ہے، ہار تو نہیں چرایا''، ''گھڑی بیچی ہے، قومی دولت سے لندن میں فلیٹ تو نہیں خریدے''، ''گھڑی بیچی ہے، لندن میں محل تو نہیں بنائے''، ''گھڑی بیچی ہے لندن میں جرمانے تو نہیں ہوئے''...

جو لوگ اس منطق کو پیش کررہے ہیں ان کی خدمت میں انتہائی ادب سے عرض ہے کہ حضور بے شک خان صاحب نے صرف گھڑی بیچی ہے، لیکن یہ عمل اس شخص سے سرزد ہوا ہے جو ہجوم کو قوم بنانے چلا تھا۔ جو سبز پاسپورٹ کی عزت کروانے نکلا تھا۔ جس نے قوم کو جینے کی امید دلائی تھی۔ جو اقوام عالم میں ہمیں ہمارا کھویا ہوا مقام دلانا چاہتا تھا۔ جو سعودی عرب اور ایران کے درمیان ثالث بننے جارہا تھا۔ جو مسلم امہ کو ایک پلیٹ فارم پر اکھٹا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جسے قائداعظم ثانی کہا جاتا تھا۔ جس کی گفتگو جلسے جلوس میں ہی نہیں اقوام متحدہ جیسے پلیٹ فارم پر بھی ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' سے شروع ہوتی تھی۔ جس کا انتخاب ہی قوم نے اس لیے کیا تھا کہ وہ دوسروں سے الگ تھا۔ اس لیے ایسے شخص کی جانب سے ایسی حرکت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

وہ تمام لوگ جو اس انداز میں اس فعل کا دفاع کررہے ہیں براہِ کرم ایسا نہ کریں۔ ہم سب مل کر خان صاحب سے درخواست کریں کہ وہ قوم سے معافی مانگیں اور اس معاملے کو ختم کریں۔ کیونکہ وطن عزیز میں گھڑی کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں جنہیں ترجیحی بنیادوں پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ مطالبہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ گھڑی کے علاوہ توشہ خانہ سے مستفید ہونے والے تمام افراد کا احتساب کیا جانا چاہیے۔ مستقبل کے حوالے سے ایسی قانون سازی کی جانی چاہیے کہ سربراہ مملکت کو ملنے والے تحائف گھروں کو لے جانے کا سلسلہ بند ہوجائے، تاکہ آئندہ اس طرح کے واقعات ہماری سبکی کا باعث نہ بن سکیں۔ مزید برآں صاف شفاف احتساب یا بھارت کی طرز پر ٹیکس معافی کے ذریعے کرپٹ سیاستدانوں اور دیگر بااثر افراد کا احتساب کرکے ملکی دولت کی واپسی ممکن بنائی جائے۔ بصورت دیگر ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ اور مخالف گروپ ایسے واقعات کو دوسرے پرکیچڑ اچھالنے اور اپنی کارکردگی چھپانے کیلیے مخصوص میڈیا گروپ کے ذریعے استعمال کرکے قوم کو گمراہ کرتا رہے گا۔

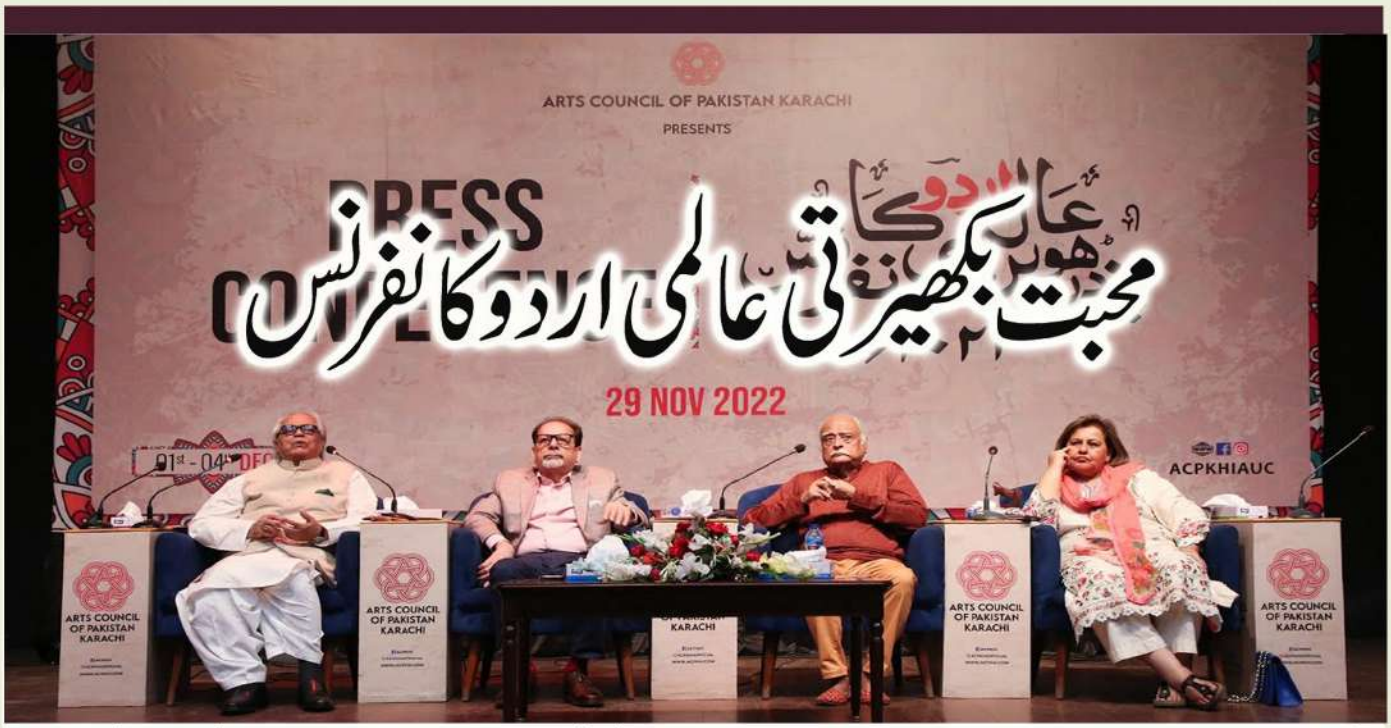


# محبت بکھیرتی عالمی اردو کانفرنس

**گزشتہ 15 سال سے کراچی میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا ایسا ہی ایک میلہ سجتا ہے آرٹس کونسل آف پاکستان میں اس سال پندرہویں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد**

**عالمی اردو کانفرنس میں کئی کتابوں کی تقریب رونمائی بھی ہوئی۔ ملک کے نامور صحافیوں نے دور حاضر کے صحافیوں کو درپیش چیلنجز پر بھی تبادلہ خیال کیا**

آج کے اس دور میں دنیا بھر کے ممالک آپس میں چھوٹے بڑے تنازعات میں الجھے ہوئے ہیں۔ کہیں سرحدوں پر لڑائیاں جاری ہیں، کہیں ایک دوسرے کے خلاف سازش تو کہیں کھل کر مخالفت۔ ایک ہی ملک میں بسنے اور حکمرانی کرنے والی سیاسی جماعتیں اور ان کے قائدین بھی ایک دوسرے پر تنقید ہی کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن اسکرین دیکھیں یا سوشل میڈیا پر اسکرولنگ کریں، سیاست دان ایک دوسرے کی دھجیاں اڑاتے نظر آئیں گے۔ کسی سیاسی جماعت کے جلسے کو کچھ دیر دیکھ یا سن لیں تو ایسا معلوم ہوگا اپنے ہی ملک میں سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ تفریحی پروگراموں پر نظر ڈالی جائے تو اپنے رسم ورواج کہیں نظر نہیں آئیں گے یا تو مغربی رنگ چھایا ہوگا یا پڑوسی ملک کے اسکرپٹ سے متاثر ہونے کا تاثر ملے گا۔

بلاشبہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس کے اثرات لیتے ہیں۔ لہٰذا اب معاشرے میں ہر طرف خاندانی جھگڑے نظر آنے لگے ہیں۔ عوام میں برداشت کا مادہ بھی ختم ہورہا ہے۔ ایسا میں ایک خیال دل میں آتا ہے ہم شعرا کو کیوں نہیں سنتے؟ ادیبوں کو کیوں نہیں پڑھتے، کیوں نہیں دیکھتے؟ ایک دوسرے پر ہونے والی تنقید پر توجہ کے بجائے فنکاروں کے فن پاروں پر کیوں توجہ مرکوز نہیں کرتے؟ شاید ایسا کرنے سے ہم قدرت کے قریب ہوں، دنیا کو ایک نئی نظر سے دیکھیں، دنیا پُرامن ہوجائے، محبت کا درس ہر طرف عام ہو۔

گزشتہ 15 سال سے کراچی میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا ایسا ہی ایک میلہ سجتا ہے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان میں اس سال پندرہویں عالمی اردو کانفرنس ک انعقاد کیا گیا، جس میں پاکستان اور بیرون ملک سے شعرا، ادیبوں اور فنکاروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ چار روز تک جاری رہنے والے ادبی میلے کی افتتاحی تقریب میں وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ، صوبائی وزیر سردار شاہ، انور مقصور، صدر آرٹس کونسل آف پاکستان احمد شاہ سمیت سیاسی رہنماؤں، فنکاروں اور شاعروں نے شرکا سے بات کی۔

عالمی اردو کانفرنس میں 'اکیسویں صدی میں اردو شاعری اور بچوں کا ادب' پر بات کی گئی۔ یورپ اور ترقی یافتہ ممالک میں اردو کی تعلیم کہاں تک پہنچی، تعلیم اور خواتین کا کردار اور سماجی رویے جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی۔ جن ممالک میں اردو پر کام ہورہا ہے ان ممالک سے آئے سفیروں نے بھی موجودہ صورتحال سے شرکا کو آگاہ کیا۔ غزل، نظم، رباعی نے رواں صدی میں مغربی دنیا پر کیسی چھاپ چھوڑی ہے اور اس دور میں بچوں میں ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی۔ آرٹس کونسل میں انور مقصود کی طنز ومزاح سے بھرپور گفتگو نے خوب رنگ بکھیرے۔ سلمان گیلانی کی میٹھی میٹھی شاعری سے بھی شرکا خوب لطف اندوز ہوئے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان میں ہونے والی عالمی اردو کانفرنس کی خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں نوجوان شعرا اور ادیبوں کو بھی اپنی بات کہنے اور کلام سنانے کا موقع دیا جاتا ہے۔

عالمی اردو کانفرنس میں کئی کتابوں کی تقریب رونمائی بھی ہوئی۔ ملک کے نامور صحافیوں نے دور حاضر کے صحافیوں کو درپیش چیلنجز پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ عالمی اردو کانفرنس میں جہاں قومی زبان پر گفتگو ہوئی، وہیں پاکستان کی علاقائی زبانوں اور ثقافت سے بھی حاضرین کو روشناس کرایا گیا۔ پشتو، سندھی، پنجابی اور بلوچی ادب اور ثقافت پر مختلف دنوں میں سیشن کا انعقاد کیا گیا۔ مقررین کا کہنا تھا کہ اردو تمام زبانوں کو سینے سے لگاتی ہے اسی لیے مختلف زبانوں پر مقالوں کا انقعاد کیا گیا ہے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان جہاں خوبصورت زبانوں کا ایک میلہ ہے وہیں کتب بینی کو فروغ دینے کیلیے اس کانفرنس میں کتب میلہ بھی لگایا گیا جہاں مختلف زبانوں میں لکھی گئی کتب کے اسٹال لگائے گئے۔ آرٹس کونسل میں منعقدہ عالمی اردو کانفرنس میں ہر عمر کے مرد وخواتین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ لوگ اس کانفرنس میں شرکت کیلیے دوسرے شہروں اور بیرون ملک سے بھی آئے جو کہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں میں ادب وفن کے حصول کی تڑپ اور پیاس اب بھی ہے۔ بلاشبہ اس کانفرنس کا انعقاد ادب پسندوں اور زبانوں کی لازوال خدمت ہے۔

صدر آرٹس کونسل نے اس کانفرنس کو دوسرے شہروں میں منعقد کرنے کے ارادے کا بھی اظہار کیا ہے۔ اگلے سال بھی یہ کانفرنس اپنی آب وتاب سے ہوگی لیکن اس دوران حکومت، ادبی تنظیموں، مقامی حلقوں اور دیگر شہروں میں بسنے والے فن پسندوں کو بھی ایسی کانفرنسوں اور محفلوں کا انعقاد کرنا ہوگا۔ ٹی وی چینلز کو بھی پرائم ٹائم میں سے کچھ وقت ادبی پروگراموں کو دے کر عوام میں فن وادب سے محبت کو اجاگر کرنا ہوگا۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ بچوں کی تربیت کیلیے بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی جائے۔ ہمیں اپنے ادب، اپنی زبان اور اپنی ثقافت کے ساتھ زندہ رہنا ہے اور انہیں ہمیشہ یاد رکھنا ہے، جبھی ہم ایک عظیم قوم کہلائیں گے۔ ادب کی یہ خدمت صرف آرٹس کونسل اور اس کی کابینہ کی ہی ذمے داری نہیں بلکہ ہر اردو پسند کا قومی فریضہ ہے۔

ABC CERTIFIED

Pakistan's 1st Human Rights Educator

WWW.HRPOSTPK.COM

HUMAN RIGHTS POST

HRP

15 YEARS

Service in Human Rights Publications

Vol:15 Issue 12 - DECEMBER 2022

# Stand Up for Human Rights

UNITED NATIONS HUMAN RIGHTS
OFFICE OF THE HIGH COMMISSIONER

75 UNIVERSAL DECLARATION OF HUMAN RIGHTS

DIGNITY, FREEDOM & JUSTICE FOR ALL

## This year's Human Rights Day slogan is "Dignity, Freedom, and Justice for All"

## 'Pakistan may face alarming level of water scarcity by 2025'

انسانی حقوق پر پہلی نیوز ایجنسی، حکومت پاکستان سے منظور شدہ

HRNW

اردو اور انگریزی میں خبروں کی ترسیل

www.hrnww.com hrnww.com/urdu

HUMAN RIGHTS NEWS WORLDWIDE
HRNW
PAKISTAN'S 1ST HUMAN RIGHTS NEWS AGENCY

Regd.SS-No.1260

HUMAN RIGHTS POST

# HRP

14 YEARS

Monthly HUMAN RIGHTS POST Karachi

ماہنامہ ہیومن رائٹس پوسٹ کراچی

## Team HRP

CHIEF EDITOR
*Nadeem Ahmed*
EDITOR
*S.Talat A. Shah*
JOINT EDITOR
*Rubina Nadeem*
ASSITANT EDITOR
*Javaid ur Rehman Khan*
DESIGN & GRAPHICS
*HRP Team*
BUSINESS MANAGER
*Muhammad Irfan*
CIRCULATION
*Sheikh Mehboob ul Haq*
PUBLISHER
*Nadeem Ahmed*
LEGAL ADVISOR
*Muhammad Zahid Khan*
PRINTER
*Sohail Ahmed*

**FOREIGN CORRESPONDENTS**
UNITED STATES OF AMERICA
*Syed Mir Alam*
CANADA
*Muhammad Adnan Farooq*
UNITED KINGDOM
*Rawal Rath*
AUSTRALIA
*Younus Mohammad*
JAPAN
*Farhan Ahmed*
U.A.E
*Mohammad Saqib Khan*
TURKEY
*Amir Loona*

## INSIGHTS

**Note:** The team of HRP is working voluntarily except some technical and editorial staff. Human Right Post is non profit mission for sake of Human Rights awareness in Pakistan.

Office: B-6, Ali Centre, SB/7, Block-13/C
Gulshan-e-Iqbal, Karachi-75300, Pakistan
humanrightspostpk | www.hrpostpk.com
@hrpakistan | info@hrpostpk.com

# Human Rights Press Awards in Asia Relaunches for 2023

## Human Rights Watch and Arizona State University to Administer Prizes

Human Rights Watch and the Walter Cronkite School of Journalism and Mass Communication at Arizona State University marked World Human Rights Day today by announcing that they will be co-administering the Human Rights Press Awards which previously were administered by the Foreign Correspondents Club of Hong Kong (FCCHK) for over a quarter century. The application process opens today and will run through February 1.

FCCHK suspended the awards, which recognize the best in human rights reporting in Asia, following the Chinese government's imposition of a draconian national security law in Hong Kong in June 2020. Since then, Hong Kong authorities' assault on press freedom has shuttered one of the city's largest papers, Apple Daily, along with at least eight other outlets. Such risks led to FCCHK's decision not to administer the awards.

The Human Rights Press Awards have a long and distinguished history of recognizing outstanding reporting on human rights issues in Asia. Previous winners include Philippine journalist and Nobel Prize winner Maria Ressa and Malaysian-born Los Angeles Times photojournalist Marcus Yam, winner of this year's Pulitzer Prize for breaking news photography.

"Human Rights Watch is pleased to continue the tradition of recognizing, rewarding, and supporting great reporting on human rights issues, especially at this critical time in Asia," said Tirana Hassan, acting executive director of Human Rights Watch. "In a time of disinformation and propaganda, powerful fact-based reporting on what is happening in China, Afghanistan, Myanmar, and so many other places is crucially important."

The goal of the awards is to increase respect for people's basic rights and to focus attention on threats to those freedoms. It receives hundreds of entries every year from across Asia. There are 16 categories ranging from breaking news to commentary and include all mediums - writing, photography, video, audio, and multimedia. There are no fees for submitting nominations, and entries may be in English or Chinese.

"The Cronkite School is more than just one of the premier journalism and mass communication programs in the U.S. - we aim to be a global force for change. This partnership with Human Rights Watch fits with that mission by providing a rock-solid foundation for the Human Rights Press Awards' second quarter-century," said Dr. Battinto L. Batts, Jr., Dean of the Cronkite School. "The next 25 years will see these awards recognized as the world's pre-eminent honors for human-rights reporting."

The 2023 winners will be announced on May 3, 2023, World Press Freedom Day. Human Rights Watch and the Cronkite School will also recognize 2022's winners who were not formally recognized following the cancelation of the awards in Hong Kong.

# Reflecting on progress and renewing commitments to gender equality

"A gender equal world is a more accessible, more free, and more peaceful world," said Pashtana Dorani. "It is a fascinating world, where men and women have equal pay; a world where girls and boys are not told which color is for which, or told they cannot play sports or do anything."

Dorani is a 24-year-old political and civil rights activist from Afghanistan. She is the founder and CEO of LEARN, an NGO that promotes learning for girls in Afghanistan, and continues to do so, despite the ongoing ban on secondary education for girls that took effect in the country after the Taliban takeover in 2021.

The efforts of women human rights defenders like Dorani continue to be indispensable for the rights of women and girls.

"We are witnessing the courageous women and girls in Afghanistan and in the Islamic Republic of Iran who are demanding an end to systematic discrimination against them as well as socioeconomic and legal reforms to ensure their rights and justice," said UN High Commissioner for Human Rights, Volker Türk.

However, women's rights and gender equality are under threat, he added.

Societies are seeing the resurgence of conservative narratives that relegate woman to a secondary's role, with the rise of "authoritarian, patriarchal and misogynistic narratives that reward toxic masculinity and legitimize sexism," said Türk.

The backlash against women's human rights and gender equality has reached new heights, with escalation of attacks against gender equality and women's rights globally, said Hannah Wu Section Chief of Women's Human Rights and Gender Equality at UN Human Rights.

"The international community must take powerful actions to address the urgent situations where women and girls are risking their lives for demanding human rights and equality," she said.

Progress can never be achieved if we do not tackle the root causes of gender-based discrimination and inequality, she added.

"The misuse of culture and religion, is where the scourge of gender-based discrimination starts," explained Wu. She has called for a more holistic approach to advancing women's and girls' human rights with a focus on prevention rather than reaction.

Reflecting on progress

In order to continue the fight for gender equality with unwavering determination, societies and individuals alike, must draw inspiration from the progress that has been made in women's rights throughout the years. Acknowledging the tremendous advancement that has been made, yet knowing that there still remains a long way to go.

Nearly 75 years ago, the Universal Declaration of Human Rights was drafted, setting out, for the first time, the fundamental rights to be universally protected. The UDHR has inspired laws, legislation, even movements that have strived to ensure dignity, freedom, and justice for all.

Women played an integral role in the drafting of the UDHR. The drafting committee was lead by Eleanor Roosevelt. And it was the suggestion of drafter Hasna Mehta from India, that the original language of the document was changed from "all men" to "all human beings" throughout the document, demonstrating that gender equality was non-negotiable.

"The UDHR is a great pathway to accessing all the human rights," said Dorani, the Afghan activist.

Yet, this promise of dignity and equality for all is not the reality for many women around the world, who find the space for protest and expression severely curtailed or disappeared, she said. It is particularly true for women and girls in her home country, she explained.

# "So What If He Hit You?"

## Addressing Domestic Violence in Tunisia

My father was very violent with me, and my mother treated me differently from my siblings. I thought that by getting married I'd escape my family's violence. But it only got worse. My husband started beating me on our wedding night. I had my period and did not want to have sex, but he wouldn't accept it. He hit me, held me down, and forced me to do things. He calls me a worthless whore all the time. In bed, he forces me to do things that make me so ashamed I cannot pray and face God for days. I clean every inch of our house but he always finds a reason to beat me.

I didn't want to complain, but in March 2021, he hit me on the head with a brick. He said he could see the devil in me and that he wanted to destroy me. I had no choice but to complain. I got a medical certificate from the hospital that prescribed seven days of rest. I went to the police to show them the certificate and the death threats that my husband had sent me on WhatsApp. But after my husband spoke with them, the police dissuaded me from filing a complaint. The following day, I went to court to file a complaint there. Meanwhile, my husband apologized, and I dropped the complaint.

He became more violent. In September 2021, I went to a different police station to ask for a protection order. They refused to help me, so I went to court. When they refused to help me too, I opened the window to jump off the tribunal's second floor. Someone held me back.

I know my husband won't change. He tells me he isn't scared of the police. He knows I won't try to complain anymore because I have no money and nobody to support me. If I did put him in jail, what would happen to me? Who else will look after me? How will I survive with two kids on [his post-divorce financial support] of 250 dinars (US$80) a month? My family doesn't want to take me and my children in. If I didn't have kids, I would just live on the street. I've called shelters but they rarely answer the phone and when they do, they say they can't take me in. I feel like I am walking to my own grave.

As of September 2022, "Nahla," a 40-year-old from Ben Arous interviewed by Human Rights Watch, was still living with her husband.

Key Findings

Nahla's experience reflects how the compounded failures of different authorities can leave women with no alternative than living with an abusive partner, leaving them at risk of abuse and femicide.

Women have reported harrowing experiences of domestic abuse to Human Rights Watch. Men had locked them up; beaten them with objects; threatened to kill them; raped them; forced them to work for them in austere conditions without compensation; deprived them from food while pregnant; confiscated their money; abandoned their household; or verbally humiliated them, daily, at times in public.

During 2021, the police registered nearly 69,000 complaints of violence against women and girls.[3] The most recent national survey on violence against women, published in 2010, reported that half of Tunisian women had experienced at least one form of violence in their lives.[4] The real magnitude of domestic violence is however difficult to gauge, in part due to poor data collection and the social and economic pressure on women to tolerate men's violence.

This report examines Tunisian authorities' response to domes-

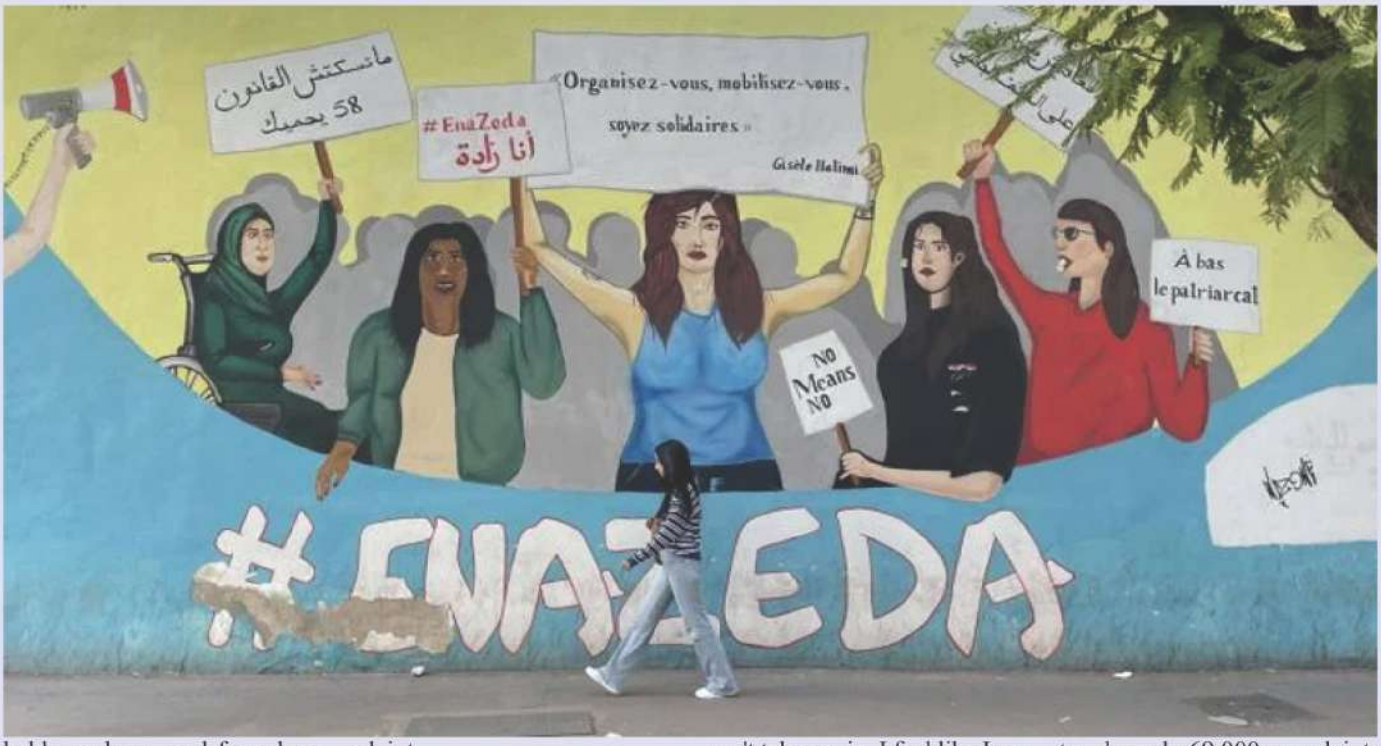

tic violence, five years after the adoption of Law 2017-58 on the Elimination of Violence Against Women (hereafter Law-58), one of the most progressive legal framework aiming to eliminate physical, moral, sexual, economic, and political forms of violence against women in the Middle East and North Africa.

Law-58 has introduced progressive prevention, protection, and prosecution provisions, and assured survivors' access to appropriate services. It introduced unprecedented protection measures and orders aimed at keeping abusers away from the spousal domicile and survivors. It toughened sentences for some crimes where the abuser is a family member or (ex-)spouse/fiancé and introduced new crimes relating to economic and psychological violence. The law also abrogated provisions that had allowed for the termination of proceedings or the quashing of convictions if a survivor withdrew her complaint; and provisions that had allowed for impunity or lenient punishment of abusers such as provisions that exempted a rapist from punishment if he married the survivor.

The adoption of Law-58 appears to have marked a distinct shift in public awareness of violence against women in Tunisia. The 2019 #EnaZeda (#MeToo) movement and the public communications around the five-fold increase in reporting of violence against women under Covid-19 lockdowns in Tunisia, likely also contributed to this change.

Overall, the report finds that, despite considerable legislative and institutional progress, and the genuine commitment of individual state officials and service providers to assist survivors, the insufficient allocation of financial means toward Law-58's implementation problematic attitudes among the police and judiciary have has led to inconsistencies and failures in the state's response to domestic violence. Ultimately, a woman's ability to exercise the rights granted to her by Law-58 is contingent on the will of service-providers addressing her complaint; the proximity of savvy nongovernmental organizations to accompany her; and her individual characteristics and persistence.

Tunisia's 2022 constitution guarantees equality of women and men before the law, and Law-58 obligates the state to adopt measures to prevent violence against women including to take every necessary measure to eliminate all discriminatory practices against women.[6] However, women continue to face discrimination in law and practice that can leave them vulnerable to violence. Moreover, some of Tunisia's Constitutional provisions could be used to limit women's rights based on interpretations of religious precept. The Ministry of Women in its 2020 report remarked that discriminatory codes and laws against women hindered the implementation of Law-58.

Tunisia's 1956 Personal Status Law, adopted shortly after its independence from France, was historic in how progressive it was in advancing women's rights compared to countries across the region as well as France and other European countries. However, discriminatory provisions that remain - for instance deeming men as heads of households, language that can suggest an obligation on spouses to conform to stereotypical gender roles, and discriminatory inheritance provisions - leave women more exposed to violence. Moreover, public morality laws and the criminalization of same-sex relations under Article 230 of the penal code may deter lesbian, bisexual, or transgender women (hereafter LBT women), as well as women abused by partners to whom they are not engaged or married, from reporting domestic violence to authorities to avoid risks of facing prosecution instead of receiving protection or justice.

State policies reinforce women's role as providing unpaid domestic care, and leave women financially dependent on men, contributing to their exposure to male violence against women, which comes with significant social, economic, and developmental costs for the state.

Law-58 also directed ministries and state institutions to prevent and combat violence against women including through education, training, detection, awareness raising, and providing information, care, and ongoing support to survivors.

However, efforts to inform women of their rights and the services available to them are deficient, especially among rural and illiterate populations. Street signage and banners indicating the location of support services and Law-58's key provisions in strategic venues are rare. The detrimental impact of weak public communication efforts is compounded by the failure of overwhelmed, undertrained, or negligent frontline respondents to clearly inform women of their rights to protection orders, legal aid, shelter, and other support.

In a positive move, only six months into the law's implementation, the Ministry of Interior established 128 specialized units across the country for the elimination of violence against women dedicated to the investigation of cases of violence against women, as the law required. However, the specialized units are only operational during administrative hours and not all units guarantee privacy or include female staff to interview complainants. Problematic attitudes and practices in the response by specialized units

and regular police officers to domestic violence persist. They include lack of communication of survivors' rights, dismissive attitudes, and continued recourse to pledges or family mediation that force women to reconcile with their abusers rather than informing them of their rights to protection under the law. Mechanisms to identify risks of femicide requiring immediate protection have not been rolled out throughout the country.

Law-58 provides for temporary protection measures that the police can request from prosecutors at the survivor's request, as well as longer-term protection orders that courts can issue without the survivor needing to file a criminal complaint or divorce. This permits authorities to forbid alleged abusers from approaching survivors and their children, while allowing survivors to remain safely in their homes while they decide on their next steps. UN Women describes protection orders as "among the most effective legal remedies available to complainants/survivors of violence against women."[7] However, lack of available data on the number of protection measures or protection orders issued prevents an accurate assessment of their use and impact.

One of the biggest barriers that six women complained about is that police insisted on arbitrary evidentiary requirements - namely, recent medical certificates - to launch investigations or provide protection measures, even though Law-58 does not require this. Women reported differing time limits that police considered to be valid for medical certificates, sometimes as little as 48 hours, in order to take action. Such requirements deprive women from protection as authorities may turn them away if their medical certificates are deemed too old, ultimately exposing them to further risks of violence. Survivors often need time until they decide whether or not they want to complain against their abusers.

"Ahlem," 26, from Sidi Bouzid, who was beaten, humiliated, and forced to work without compensation for seven years by her husband, said the police had turned her down when she had decided to file a complaint against him in August 2021:

When I got to the police station, the police told me I could not do anything with my [four] medical certificates [issued in 2020 and 2021] because all of them had been issued more than 15 days ago. I felt so discouraged. I am illiterate and no one had told me my certificates would lose their validity after a couple of weeks. Why aren't women allowed to keep them as weapons under their pillows to use once they are ready to fight back?

Law-58 provided for survivors' right to medical, psychological, and social support and follow-up. However, in most regions, only medical certificates have been issued free of charge to survivors of domestic violence, and some women have reported having had to pay for medical certificates. Fees for additional medical examinations, along with transportation costs, can have a dissuasive effect on survivors. In 2022, the Ministry of Women and the Ministry of Health issued a ministerial note (n°5-2022) to address this gap in implementation and reaffirm survivors' right to free initial medical certificates and to flexible payment schemes for other medical expenses.[10] Overstretched medical staff rarely inform survivors of their rights or refer them to psychologists or other support services. The police and judiciary overly rely on medical certificates to launch an investigation or in conviction, and yet access to forensic expertise is limited in most of the country. Due to the lack of forensic doctors, the prevailing practice is for general physicians to examine complainants of domestic violence, yet both general physicians and forensic doctors lack guidelines on how to determine physical incapacitation in domestic violence cases. In 2020, the only public counseling center in Tunisia dedicated to survivors' psychological wellbeing closed due to lack of funding.

Law-58 significantly broadened the scope of criminal law to combat male violence against women in its physical, moral, sexual, economic, and political forms, and set out free support services for survivors. However, the judiciary's response to domestic violence has been characterized by lengthy proceedings, alleged reluctance of some family judges to implement the law, failure to investigate withdrawn complaints, and the complainants facing challenges accessing provision of free legal aid or had ineffective legal assistance. During the first weeks of Covid-19 lockdowns in 2020, the Ministry of Justice failed to prioritize cases of domestic violence.

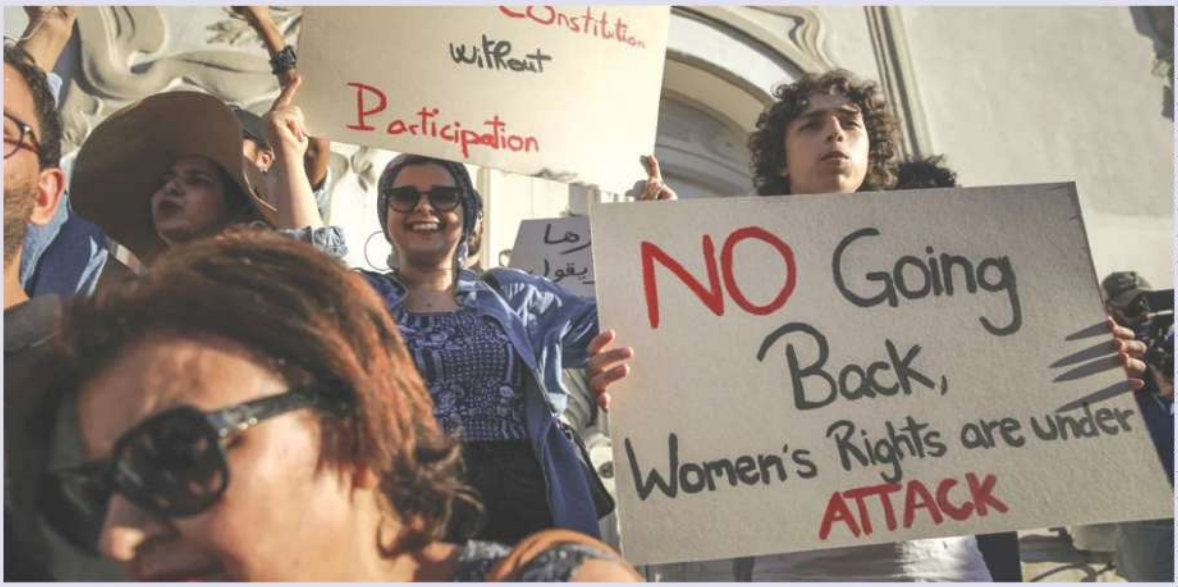


Shelters for survivors are essential to an effective response to domestic violence. Law-58 set out that survivors have a right to emergency shelter, but did not specify the number of shelter spaces to be made available or their funding mechanism. Without enough shelters, organizations and state institutions have nowhere to refer women to. The number of operational shelters for survivors has fluctuated since the law's adoption, especially outside of the capital, and remains insufficient. In 2021, only five shelters, with a cumulative hosting capacity of approximately 107 women and children, were operational - only one of which was outside of the governorate of Tunis. In a positive move, in the summer of 2022, the Ministry of Women and its international partners supported the opening of five additional shelters.[11] At time of writing, the total hosting capacity of shelters across the country is estimated at 186 women and children, based on Human Rights Watch's mapping of available shelters.[12] The Ministry of Women plans to open more shelters to ensure at least one shelter is operational in each of Tunisia's 24 governorates by 2024.

# The Universal Declaration: A catalyst for environmental human rights action

"Social justice is climate justice. Climate change is a human rights issue as the climate crisis exacerbates inequalities," said environmental human rights defender, multimedia journalist and film director, Sophia Li.

Li is the co-founder and co-host of All of the Above, the first sustainability talk show.

She also is the host of Meta's podcast, Climate Talks and serves on the Board of Directors of environmental NGO Slow Factory, and is on the advisory board of Better Shelter.

Li is part of a growing generation of human rights defenders working online and on the frontlines of environmental crises. Many of them advocate for climate justice at great risk to themselves.

In July 2022, the UN General Assembly (GA) adopted a landmark resolution recognizing the right to a healthy environment. The GA's adoption follows a similar resolution by the Human Rights Council in October 2021. Although these resolutions are not legally binding, they can catalyse changes in national and international law and represent a political consensus at the United Nations.

These resolutions were possible thanks to the efforts of a diverse array of civil society organisations, including youth groups, national human rights institutions, Indigenous Peoples' organizations, businesses, and many others worldwide who have been advocating for international recognition of this right. It was supported by UN entities working together under the Secretary-General's Call to Action for Human Rights, including UN Human Rights.

Accountability for environmental harm

The right to a clean, healthy and sustainable environment is generally understood to include the right to clean air; a safe and stable climate; access to safe water and adequate sanitation; healthy and sustainably produced food; non-toxic environments in which to live, work, study and play; and healthy biodiversity and ecosystems. It also includes access to information; the right to participate in decision-making; and access to justice and effective remedies including the secure exercise of these rights free from reprisals and retaliation.

Realizing the right to a healthy environment also requires international cooperation, solidarity and equity in environmental action, including resource mobilization. States also have the legal obligation to prevent their actions from causing environmental harms around the world.

"States that fail to protect individuals under their jurisdiction from the adverse effects of climate change may be violating their human rights under international law," said Hélène Tigroudja, member of the Human Rights Committee, the UN body that oversees States' compliance with the International Covenant on Civil and Political Rights.

In September 2022, the Committee rendered a decision against Australia following a complaint filed by eight Indigenous Australian nationals and six of their children living in four small, low-lying islands in the Torres Strait region. For the past 2000 years, these islands have been the home of indigenous peoples who had been living in harmony with the ocean.

The complainants claimed their rights had been violated as Australia failed to adapt to climate change by, among others measures, upgrading seawalls on the islands and reducing greenhouse gas emissions. They said changes in weather patterns have direct harmful consequences on their livelihood, their culture, and traditional way of life. Severe flooding caused by the tidal surge in recent years has destroyed ancestral burial sites, and heavy rainfall and storms have degraded the land and trees reducing the amount of food available from traditional fishing and farming.

Although the Torres Strait islands case was only the second environmental case brought under the individual complaints procedure of the Human Rights Committee, it forms part of a growing number of national and international litigations that have been seeking to hold governments and businesses accountable for their climate inaction.

According to New York University's Climate Litigation Accelerator, some 200 cases are being adjudicated worldwide. The body of legal precedents developed in these cases, including with respect to the right to a healthy environment, will play an important role in future efforts to advance accountability for environmental harms.

"The right to a healthy environment can be a unifying force across international environmental and international human rights law," said Benjamin Schachter, Environment Team leader at UN Human Rights. "Orienting environmental action around the fulfilment of the right to a healthy environment can be transformative particularly for those who have contributed the least to the triple planetary crisis, many of whom are already struggling to cope with its worst impacts.".

Rights in jeopardy

Climate change, biodiversity and ecosystem loss, and pollution are affecting the human rights of all people globally, including the rights to life, food, water, an adequate standard of living, a healthy environment, development, and health. These crises coupled with unsustainable development represent serious threats to the ability of present and future generations to enjoy these rights first enshrined in the Universal Declaration of Human Rights (UDHR) almost 75 years ago.

Displacement is one of the central issues of recent times. To the tens of millions primarily displaced by war, conflict and persecution, a new and growing category of displaced people can now be added: those fleeing climate-related disasters. The Global Report on Internal Displacement by the Internal Displacement Migration Centre indicates that 30 million people were newly displaced by climate-related disasters in

# Designing transformative solutions for disability inclusion

"I lost my job to ableism," Keely Cat-Wells said.

Cat-Wells, a British national, moved to Los Angeles, United States, to explore career opportunities in the entertainment industry. There, she was offered a job. However, that offer was rescinded when she disclosed her impairment.

Having recently moved to the United States, Cat-Wells was unaware that she could file a discrimination suit against her former employer under the Americans with Disabilities Act. Further, she did not want to risk her immigration status and was afraid of being blacklisted in Hollywood.

Undeterred, Cat-Wells founded C Talent, a talent management and consulting company that represents high-profile online creators, performers and entertainment industry professionals with disabilities.

The company not only promotes the employment of her industry clients in diverse roles

but also advocates for the appointment of disability officers to ensure that sets are accessible. She also helps companies become accessible beyond legal compliance. In partnership with UN Human Rights and other organizations, C Talent also serves as a founding member of #WeThe15, a campaign that aims to promote greater inclusion and access to services for people with disabilities.

In its General Comment number 8, the UN Committee on the Rights of Persons with Disabilities described 'ableism' as "a value system that considers certain typical characteristics of body and mind as essential for living a life of value. Based on strict standards of appearance, functioning and behaviour, ableist ways of thinking consider the disability experience as a misfortune that leads to suffering and disadvantage and invariably devalues human life," which adversely affects the opportunities for many persons with disabilities to have meaningful work and employment.

Advocating for inclusion and representation in creative industries revealed itself to be an innovative way for Cat-Wells to create change from various angles and do away with stereotyping people with disabilities.

# This year's Human Rights Day slogan is

# "Dignity, Freedom, and Justice for All"

The 75th anniversary of the Universal Declaration of Human Rights will be celebrated on 10 December 2023. Ahead of this milestone celebration, starting on this year's Human Rights Day on 10 December 2022, we will launch a year-long campaign to showcase the UDHR by focusing on its legacy, relevance and activism.

"The Universal Declaration of Human Rights is a miraculous text," said Volker Türk, UN High Commissioner for Human Rights. "At a time when the world emerged from cataclysmic events, the Declaration set out universal rights and recognized the equal worth of every person."

On Human Rights Day (10 December), UN Human Rights will launch a year-long campaign to promote and recognise the 75th anniversary of the Universal Declaration of Human Rights (UDHR 75), which will be celebrated on 10 December 2023. The year-long campaign will showcase the UDHR by focusing on its legacy, relevance and activism using the slogan, "Dignity, Freedom, and Justice for All."

"The Declaration – which was drafted by representatives from all over the world – embodies a common language of our shared humanity, a unifying force at the heart of which lies human dignity and the duty of care we owe each other as human beings," Türk said.

It is the global blueprint for international, national, and local laws and policies. The Declaration is also a foundation of the 2030 Agenda for sustainable development, which promotes an economy that invests in human rights and works for everyone.

The UDHR 75 campaign will increase global awareness of the UDHR by showing how the Declaration has guided the work of the Office. It will then promote the universality of human rights and empower everyone, especially young people, to stand up for human rights.

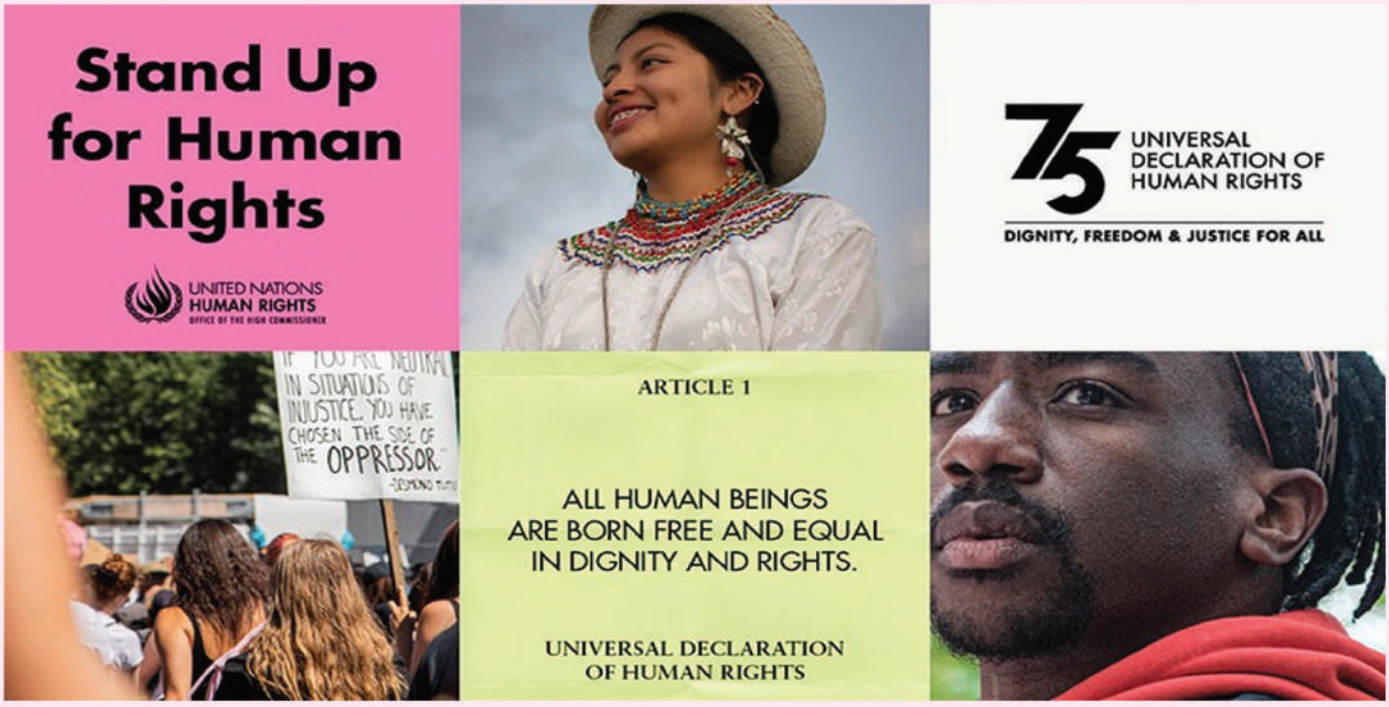


Since the adoption of the UDHR in 1948, human rights have been more guaranteed and recognised around the world including improvements in the rights of women, children, and young people, of indigenous people to guard and maintain their land and culture, and the abolition of the death penalty in many countries.

But the promise of the UDHR, of dignity and equality in rights, has been under attack. The world is facing a climate crisis, the COVID-19 pandemic, increasing conflicts, economic instability, misinformation, racial injustice, and global setbacks on women's rights. People are frustrated and have lost trust with what's being seen as the inaction and irrelevance of governments and institutions in protecting human rights. Young people don't feel heard or know the existence of the Declaration.

"Even as the 30 articles of the Declaration have sparked transformation in all areas of our lives, the embers of racism, misogyny, inequality, and hatred continue to threaten our world," Türk said. "The language and spirit of the Declaration have the potential to overcome division and polarization. It can make peace with nature, our planet, and point the way to sustainable development for future

# Laos: After 10 years, civil society worldwide is still asking: "Where is Sombath?"

Ahead of the 10-year anniversary of the enforced disappearance of Lao civil society leader Sombath Somphone, we, the undersigned civil society organizations and individuals, renew calls on the Lao government to determine his fate and whereabouts and deliver justice, truth, and reparation to his family. We deplore the Lao authorities' repeated failure to act on their human rights obligations to thoroughly investigate Sombath's disappearance and provide adequate, effective, and prompt reparation for Sombath and his family over the past decade.

Since Sombath, a pioneer in community-based development and youth empowerment, was abducted from a busy street in Vientiane on 15 December 2012, numerous United Nations (UN) member states and human rights monitoring mechanisms have repeatedly expressed their concern over his enforced disappearance and urged the Lao government to conduct a prompt and effective investigation into this grave human rights violation and crime under international law.

In December 2014, three UN human rights experts urged the Lao authorities to "release more information about the progress of [the] investigation, especially to his family," and to request international assistance to determine Sombath's fate and whereabouts.[1]

During the Universal Periodic Review (UPR) sessions examining the human rights performance of Laos in 2015 and 2020, a total of 11 UN member states made 15 recommendations that called on the Lao government to investigate Sombath's disappearance.[2]

In July 2018, following the review of Laos' initial report under the International Covenant on Civil and Political Rights (ICCPR), the UN Human Rights Committee regretted "the paucity of relevant information" provided by the government regarding its investigation into Sombath's case, and called on the government to "step up efforts to conduct a thorough, credible, impartial and transparent investigation" into his enforced disappearance.[3]

Following his official visit to Laos in March 2019, then-UN Special Rapporteur on extreme poverty and human rights Philip Alston urged the government to "finally allow a meaningful investigation" into Sombath's disappearance.[4]

Four special procedures of the UN Human Rights Council have sent three communications to the Lao government to demand it provide information on Sombath's fate and whereabouts and about any investigations carried out into his enforced disappearance, one as recently as 2021.[5]

Regrettably, the Lao government's response to the international community's extraordinary expressions of deep concern has been characterized by a catalogue of apparent inaction, negligence, cover-ups, and misleading statements, and an overall lack of political will to effectively address Sombath's enforced disappearance.

The Lao authorities have completely failed to uphold their international legal obligations to investigate Sombath's disappearance and to bring those suspected of criminal responsibility to justice in fair trials before ordinary civilian courts, including under the ICCPR and the UN Convention against Torture and Other Cruel, Inhuman or Degrading Treatment or Punishment, to which Laos is a state party. While Laos is yet to ratify the International Convention for the Protection of all Persons from Enforced Disappearance (ICPPED), which it signed in 2008, under international law it is obliged not to defeat the treaty's object and purpose.

The impact of enforced disappearances on the relatives of the disappeared often also constitutes torture. The UN Working Group on Enforced and Involuntary Disappearances has recognized that official denial of information to relatives of the disappeared about the truth of their fate and whereabouts adds to the "continuous torture" enforced disappearance inflicts upon relatives. The ICPPED further requires officials to ensure family members are informed on the progress and results of all appropriate measures authorities are obliged to take to search for, locate, and release disappeared persons.

Since December 2012, the Lao authorities have met with Sombath's wife, Shui Meng Ng, only four times - the last instance in December 2017. Officials have not provided her with any updates on her husband's situation since then, despite her repeated requests.

The government's last public remarks on Sombath's case were made during the third UPR of Laos in September 2020, when a government representative merely said the search for Sombath was "the duty of the Lao government."

Now, more than ever, we stand in solidarity with Sombath's family and all other victims of enforced disappearances in Laos. We reiterate our call on the Lao authorities to determine the fate or whereabouts of all victims of enforced disappearances in Laos, identify the perpetrators of such serious crimes, and provide victims with an effective remedy and full reparations. We also urge the government to accelerate the process of ratification of the ICPPED without making any reservations and to implement it into national law.

We have been pressing for justice and accountability for 10 years. We will not stop demanding the truth until Sombath is found and justice is delivered for him and his family. Once again, we are united in asking a simple and straightforward question to the Lao government: "Where is Sombath?"

Background

Sombath Somphone was last seen at a police checkpoint on a busy street of Vientiane on the evening of 15 December 2012. Footage from a CCTV camera showed that police stopped Sombath's vehicle at the checkpoint and that, within minutes, unknown individuals forced him into another vehicle and drove him away in the presence of police officers. CCTV footage also showed an unknown individual later arriving, and driving Sombath's vehicle away from the city center. The presence of police officers at Sombath's abduction and their failure to intervene is prima facie evidence of the involvement of state agents' participation in Sombath's fate, rendering it a presumptive case of enforced disappearance.

# "We Can Arrest Anyone We Want"

## Widespread Human Rights Violations Under El Salvador's "State of Emergency"

Between March 24 and 27, 2022, 92 people were killed in El Salvador, seemingly by gangs. The killings, which amounted to the deadliest peak in lethal violence in the country's recent history, were a bleak reminder of El Salvador's failure to take sustainable and rights-respecting measures to fulfill its duty to protect the population from chronic gang violence.

In response, and at the request of President Nayib Bukele, the Legislative Assembly promptly adopted a 30-day "state of emergency," suspending a range of constitutional rights, including the rights to freedom of association and assembly, to privacy in communications, and to be informed of the reason for arrest, as well as the requirement that anyone be taken before a judge within 72 hours. The Assembly, where President Bukele's New Ideas (Nuevas Ideas) party has a two-thirds majority, also expanded counterterrorism legislation in ways that violate basic rights, including by allowing judges and prosecutors to try to jail children ages 12 and above.

Between March and November, police officers and soldiers have conducted hundreds indiscriminate raids, particularly in low-income neighborhoods, arresting over 58,000 people, including more than 1,600 children. Officers have often targeted communities where people have, for years, suffered insecurity and lack of economic and educational opportunities.

This joint report by Human Rights Watch and Cristosal documents widespread human rights violations committed during the state of emergency, which the Assembly has extended eight times and remains in place at time of writing. These human rights violations include arbitrary arrests, enforced disappearances, torture and other ill-treatment of detainees, and significant due process violations. In addition, the circumstances of many deaths in custody during the state of emergency suggest state responsibility for those deaths.

Between March and November 2022, Human Rights Watch and Cristosal interviewed more than 1,100 people from all 14 states in El Salvador, including during a Human Rights Watch visit to San Salvador in October. Interviewees included victims of abuse, their relatives and lawyers, witnesses, prosecutors, judges, journalists, human rights defenders, and government officials. Whenever possible, researchers also reviewed relevant case files, medical records, and death certificates, and in some cases consulted international forensic experts.

We found that human rights violations were not isolated incidents by rogue agents. Rather, similar violations were carried out repeatedly and across the country, throughout a period of several months, by both the military and the police.

Official policies and the rhetoric of high-level government authorities, including President Bukele, who commands the National Civil Police and the armed forces, have in some cases incentivized abuses.

Between March and late September, some police commanders appear to have established a policy of quotas, requiring officers to arrest a given number of people daily. Instead of taking measures to prevent abusive arrests, the president has publicly backed the security forces and acted in intimidating ways toward the few remaining independent judges and prosecutors in the country who could investigate violations. He has also promoted dehumanizing rhetoric

against detainees and their families, and stigmatized independent journalists and civil society groups that document abuses.

Despite this record, President Bukele remains very popular, largely because some indicators of violence appear to have improved in the short term. Homicides, which have been decreasing in El Salvador since 2015, have fallen further, although government restrictions on accessing homicide and other data and changes in the ways killings are counted make it harder to estimate the true extent of the reduction and the prevalence of other crimes.

The authorities' campaign of mass, indiscriminate arrests has led to the detention of hundreds of people with no apparent connections to gangs' abusive activity. In many cases, detentions appear to be based on the appearance and social background of the detainees, or on questionable evidence, such as anonymous calls and uncorroborated allegations on social media. In these cases, police and soldiers did not show people a search or arrest warrant, and rarely informed them or their families of the reasons for their arrest. A mother who witnessed the detention of her son said that police officers told her, "We can arrest anyone we want."

In some cases of people detained by security forces, officers refused to provide information about the detainees' whereabouts, in what amount to enforced disappearances under international law. Authorities left such victims defenseless and caused their family members inhumane and abusive uncertainty and suffering.

Lack of information about detainees' whereabouts and their conditions in detention drove hundreds of people, mostly women, to sleep outside detention facilities in the hope of receiving some information about their loved ones. In many cases, the seemingly arbitrary arrest of breadwinners severely curtailed the income of families already suffering from poverty and lack of economic opportunities.

As of November 2022, judges had charged over 51,000 people arrested during the state of emergency with gang membership and sent them to pretrial detention, often appearing to apply a recent and abusive amendment to the Criminal Code that expanded mandatory pretrial detention. Two thousand people, less than 4 percent of those detained during the state of emergency, had been released from prison, often on bail.

The prison population increased from 39,000 in March 2022 to an estimated 95,000 detainees as of November. The latest public figures, from December 2020, indicate that prisons in El Salvador have capacity for 27,000, less than one-third of the number actually detained at the end of 2022. Thousands were held incommunicado for weeks or months or were only allowed to see their lawyer for a few minutes before their hearings. At time of writing, many continue in incommunicado detention.

This mass incarceration has aggravated historically poor conditions in detention, including extreme overcrowding, violence, and poor access to goods and services essential to rights, such as food, drinking water, and health care. Some of the few people who were released from detention reported inhumane conditions and, in some cases, torture and other forms of ill-treatment.

According to Salvadoran authorities, 90 people have died in custody during the state of emergency. Authorities have failed to meaningfully investigate these deaths. In some cases, detainees who died in prison did not receive access to the medication they needed, family members said.

Judges and prosecutors repeatedly and impermissibly infringed on due process protections under international law, violating detainees' human rights and making it difficult, if not impossible, for them to adequately defend themselves during criminal proceedings. Most detainees had public defenders who faced an immense workload and often failed to provide an adequate defense.

Hearings were conducted in groups that were at times massive, with up to 500 detainees participating, often virtually, in each. Such conditions make it difficult or nearly impossible for judges, prosecutors, and detainees' lawyers to fairly assess or present evidence and arguments related to each individual detainee.

These widespread human rights violations were enabled by President Bukele's swift dismantling of democratic institutions since taking office in 2019, which has left virtually no independent government bodies that can serve as a check on the executive branch or ensure redress for victims of abuse.

Since President Bukele's party obtained a two-thirds majority

in the Legislative Assembly in May 2021, legislators from his party have severely undermined the separation of powers. They have summarily removed and replaced all five judges of the Constitutional Chamber of the Supreme Court, as well as the Attorney General, and have passed laws that allow the Supreme Court and the Attorney General to arbitrarily transfer or dismiss

independent lower-level judges and prosecutors.

In September 2022, President Bukele announced he will seek re-election in 2024, relying on a 2021 ruling by the new Constitutional Chamber that departed from longstanding jurisprudence interpreting the Constitution as forbidding immediate re-election.

The Bukele administration has also undermined transparency and accountability, including by weakening the agency in charge of ensuring access to public information. It has created a hostile environment for journalists and civil society members, who have become targets of digital and physical harassment, surveillance, seemingly spurious criminal investigations, and other attacks in response to their work on corruption and human rights violations. President Bukele and other authorities have assaulted the credibility of independent media and civil society groups, accusing them, without any evidence, of being "gang supporters."

President Bukele has tried to justify human rights violations as supposedly acceptable "errors" committed during what the government calls a "war against gangs." He also said that the government will be "watching judges who favor criminals," in what appears to be an effort to intimidate judges and prosecutors from investigating human rights violations or releasing people who are arbitrarily detained.

There are serious reasons to question the long-term effectiveness of President's Bukele security measures. Iron-fist strategies attempted by prior governments have proven to be ineffective and have at times led to more violence. Gangs have in the past benefited from policies of mass incarceration by using prisons to recruit new members. Failure to invest meaningful resources in prevention and rehabilitation policies, as well as to address illegal economies and the lack of legitimate economic opportunities that allow gangs to thrive, have contributed to the spiraling of atrocious cycles of violence.

At the same time, the dismantling of judicial independence in El Salvador means that victims of gang violence or human rights violations by security forces will have little, if any, access to meaningful remedy.

The administration of President Bukele should ensure Salvadorans' safety by taking sustainable and rights-respecting steps to protect the population and dismantle gangs, which continue to be responsible for heinous abuses. This requires developing and implementing a new security policy that promotes strategic criminal prosecutions focused on prosecuting higher-level gang leaders and investigating violent crimes, as well as addressing the illegal economies that allow these groups to thrive, including extortion, money laundering, and contraband in weapons. To do so, having a truly independent judiciary is key.

Additionally, the government should bolster efforts to reduce gang membership by taking steps to address the structural causes that push people, particularly children and youth, into gangs. These include lack of economic opportunities, social marginalization, and abusive and ineffective security policies.

The government should also expand current programs, such as the "Urban Centers of Wellbeing and Opportunity" (Centros Urbanos de Bienestar y Oportunidades, CUBO), that seek to prevent violence by increasing economic and educational opportunities for youth in vulnerable communities, and it should strengthen reintegration programs for former gang members.

International action is needed to protect the country's rapidly deteriorating rule of law and prevent further human rights violations. Despite his enormous popularity in El Salvador, President Bukele is not totally immune to international pressure.

The administration of United States President Joe Biden and the European Union should rally multilateral pressure, including from governments in Latin America, to focus attention on the situation in El Salvador, including at the United Nations Human Rights Council.

Foreign governments and international financial institutions, in particular the Central American Bank for Economic Integration (CABEI), should suspend any existing loans or donations to government entities directly involved in abuses, including the Justice and Public Safety Ministry, the National Civil Police, the Ministry of Defense, the prison system, and the Attorney General's Office, and condition any further cooperation with these institutions on significant human rights progress.

The US government has adopted positive steps by redirecting some funding away from Salvadoran institutions such as the National Civil Police and toward civil society groups. The European Union has redirected its funding of the National Civil Police toward the Ministry of Education.

Meanwhile, in recent years, the Central American Bank for Economic Integration approved significant funding to the National Civil Police, the Ministry of Defense, the prison system, and the Attorney General's Office. Several funds had not been disbursed at time of writing and the Bank's authorities said that some of the loans were being "reformulated" to replace the National Civil Police, Ministry of Defense, and the prison system as the entities charged with executing the funds. Its board of directors, composed of representatives from Central American governments, as well as Mexico, Taiwan, Argentina, Colombia, Spain, Dominican Republic, and the Republic of Korea, should condition programs on the Salvadoran government taking concrete steps to prevent and investigate torture, deaths in custody, enforced disappearances, and arbitrary detentions.

Foreign governments should also step up efforts to support independent journalists and civil society groups, which remain virtually the sole check on abuse of power and human rights violations in El Salvador.

The international community should redouble its efforts to support the rule of law in El Salvador and help ensure that Salvadorans are safe from heinous crimes by gangs, human rights violations, and other abuse of power.

# Dowry, The Only Down About Marriage

Saqib Azhar

Marriage is an institution that requires more than consent in a brown household. Pakistan, Bangladesh, and India are the biggest example of marriage as a union of families not couples. Generally, the prevailing dowry is the amount of cash, gold, assets, automobiles, and other valuables that the bride's family gives to the groom and his family in return of the "favour" that groom's family thinks they extend to bride's family. But do we need such favours for our daughters? That's the question.

Dowry System in Pakistan

Since we have entered into the official wedding season in Pakistan, the custom of exchanging gifts between the bride and groom's family is being observed as a harmless exercise; calling it 'part of our tradition'. And it all starts soon after engagement. The bride's family spend thousands of rupees just to host the groom's family and make them happy till the wedding day.

The struggle doesn't end here. Before marriage, the father arranges at least one million rupees for dowry, half a million for dinner and other food events of the wedding, a wristwatch and a ring as gifts, a Walima Day breakfast, a Maklava Day feast, clothes and food while Rukhsati and whatnot. These desires to make 'new relatives contented', lead the bride's father towards taking loan from friends and even banks. The people in his surroundings add fuel to fire by asking questions like whether the wedding would be lavish or not. The father fights to repay his debt till he succumbs to debt.

A daughter's marriage disturbs the entire economic circle of the family. If the bride has younger siblings still in educational institutes, the situation gets worst. A few close relatives get angry for not getting attention and the poor bride feels sick to her stomach that she's the cause of all this hassle and difficulties.

Dowry is a Social Menace

Why does the family feel satisfied taking a loan for such a toxic marriage?

The answer is awful and would make you doubt the mental state of the families—the entire society. They think, at least she's getting married.

According to a report published in a newspaper, at least 2000 deaths are reported because of the depression caused by failure to afford heavy dowry and not getting married timely. Unfortunately, dowry is a social threat in Pakistan affecting generations and this deep rooted tradition is part of our culture now, which is toxic to say the least. Parents need to spend on the girls' education and they should facilitate them to the point that they become financially independent through education and skills.

Factors Affecting Dowry Mentality

A video has been circulating on IG nowadays in which the heavy gold sets were being shown off. When people watch such videos, they feel like they can fulfil all of their greed and desires by demanding such extravagant items from the bride's family. Their only road to success starts from ruining the bride's family's financial health with the help of their beloved son. The situation is actually alarming in Pakistan and greed is increasing rapidly. We need effective measures to put an end to these customs, and let's set a trend to educate our daughters as much as we like to educate our sons. And if you are groom's family, have a heart!

# Ukraine: Russian Attacks on Energy Grid Threaten Civilians

## Leveraging Civilian Harm as a Tactic of War; Millions Without Electricity, Water, Heat

Russian forces' widespread and repeated targeting of Ukraine's energy infrastructure appears primarily designed to instill terror among the population in violation of the laws of war, Human Rights Watch said today. Numerous missile and drone attacks in October and November have deprived millions of civilians of at least temporary access to electricity, water, heat, and related vital services ahead of the cold winter months.

The attacks have also killed at least 77 civilians and injured 272. According to the United Nations Office for the Coordination of Humanitarian Affairs, the attacks on November 23, 2022 alone killed or injured over 30 civilians and interrupted access to power for millions throughout Ukraine. The entire population of Kyiv, estimated at around 3 million, had no access to water for the day, and parts of Kyiv, Lviv, Zaporizhzhia, and Odesa regions were completely disconnected from electricity, the UN said.

"By repeatedly targeting critical energy infrastructure knowing this will deprive civilians of access to water, heat, and health services, Russia appears to be seeking unlawfully to create terror among civilians and make life unsustainable for them," said Yulia Gorbunova, senior Ukraine researcher at Human Rights Watch. "With the coldest winter temperatures yet to come, conditions will become more life-threatening while Russia seems intent on making life untenable for as many Ukrainian civilians as possible."

The laws of war prohibit attacks on objects indispensable to the survival of the civilian population and violence or threats, "the primary purpose of which is to spread terror among the civilian population."

Russian politicians, lawmakers, and other commentators on Russian state media widely applauded the prospect of Ukrainian civilians being left without heat and water in winter. One member of parliament stated that ordinary people should "rot and freeze", another said the strikes were necessary to destroy the Ukrainian state's capacity to survive.

Average winter temperatures in Ukraine hover around minus 3 degrees Celsius and can plunge to minus 20 degrees.

Human Rights Watch gathered data from the public domain, analyzed police and fire brigade reports and official statements, and interviewed an energy company official, two energy experts, local authorities, rescue workers, and civilians in Kyiv, Lviv, Kharkiv, Odesa, Kherson, and Mykolaiv, to build a picture of the widespread and cumulative impact of the attacks on the power grid. Human Rights Watch also visited the site of at least one of the attacks that severely damaged civilian homes and killed civilians in November.

On November 16, Ukraine's office of the prosecutor general reported that Russia had carried out 92 attacks on Ukraine's energy infrastructure in October and November. Olexander Kharchenko, director of the Energy Industry Research Centre, an independent research and consulting company, told Human Rights Watch that power was disrupted in 10,700,000 households throughout Ukraine, roughly half of the country's population, due to Russia's attacks.

According to information posted by DTEK, the largest private energy company in Ukraine, as of November 15, the company's energy facilities had been attacked 13 times over one and a half months, with significant damage. In a response to a written request from Human Rights Watch, the company also stated that because of Russian attacks on power infrastructure on October 10 alone, more than 40 percent of Ukraine's energy system had been damaged. The company also said that October and November strikes killed 3 DTEK employees and injured 22.

People waiting for taxi in central Kyiv on November 24. Russia's attacks on Ukraine's energy grid on November 23, 2022 killed or injured over 30 civilians and interrupted access to power for millions throughout Ukraine. © 2022 Andre Luis Alves/Anadolu Agency via Getty Images.

On November 21, Kharchenko told Human Rights Watch that after strikes on November 15, Ukraine's overall power-generation capacity had decreased by 50 percent. During the subsequent week, authorities were able to restore only 10 to 20 percent of what had been damaged. He said it was difficult to estimate the overall damage to any particular infrastructure facility because they are interconnected, adding that further strikes, if they happen in quick succession, could result in an uncontrolled blackout, and could take 3 to 10 days to restore the system. "The whole

of Ukraine would be without electricity, water, and heating for that period," he said.

Power infrastructure is considered dual use - military and civilian-and may lawfully be the target of attacks in an armed conflict. However, such attacks are subject to the laws of war, which prohibit indiscriminate or disproportionate attacks. Human Rights Watch is not in a position to assess any concrete and direct military advantage that Russia might have anticipated in conducting the attacks on Ukraine's electricity and heat-generating grids, nor of any actual military gains made because of these attacks. However, the civilian harm was foreseeable, as is the increasing severity of that harm with the cumulative impact of each strike wave, including on the ability of civilians to remain in Ukraine and survive the winter.

The World Health Organization's Europe director, in a public statement, expressed grave concern that millions of Ukrainians are without power as winter temperatures drop. He underscored that "continued attacks on health and energy infrastructure mean hundreds of hospitals and health-care facilities are no longer fully operational - lacking fuel, water, and electricity to meet basic needs." Noting that "cold weather can kill," he added that the winter ahead "will be about survival."

Human Rights Watch spoke with a Kyiv resident and full-time caregiver for her parents, who described how lengthy electricity blackouts affected her 75-year-old mother, who has stage 4 lung cancer and is oxygen-dependent: "We have a stationary oxygen concentrator at home that becomes useless when there is no power. Without that, her oxygen levels drop to 70 percent within minutes. If there is no electricity for over two hours, we are trapped and all I can do is watch my mother struggling to breathe." Sustained blood oxygen levels at 70 percent could result in organ damage and death.

Her family has crowdsourced funds for a car battery which can keep the concentrator working for two hours. But it is not sufficient, she said, because power cuts can last for hours. A Ukrainian charity recently gave her mother a portable concentrator that has a charge of up to six hours, but, as she said, such concentrators are in very limited supply in Ukraine: "I understand that someone else who is oxygen-dependent might urgently need it soon," she said. "Maybe a child with cystic fibrosis or another cancer patient. And then what are we going to do?"

According to the United Nations humanitarian agency, the attacks on Ukraine's energy infrastructure also affected water pumping, "adding to the previous challenges faced by millions of people to access clean water or run their heating systems at home."

A 34-year-old Kyiv resident who lives with her 84-year-old mother said that her family was concerned about surviving the cold in their flat during the winter, when the temperature in Ukraine drops below zero, as well as about "cooking meals, especially for families who have small children or care for older people, and storing food when refrigerators don't work for prolonged periods of time."

The International Committee of the Red Cross Commentary on Additional Protocol 1, to which both Russia and Ukraine are parties, notes that although attacks on facilities that provide services to civilians but also direct support to military action can be legitimate, attacks and acts of destruction that are bound to have such serious effects on the civilian population that they would die or be forced to move, are not. The commentary also states that the laws of war "prohibit acts of violence the primary purpose of which is to spread terror among the civilian population without offering substantial military advantage. … This calls to mind some of the proclamations made in the past threatening the annihilation of civilian populations."

"Russia continues to flagrantly bomb energy infrastructure all over the country, putting millions of Ukrainian civilians' security and, in some cases, their very survival, on the line," Gorbunova said.

For more information and additional details, please see below.

The degree to which households are without power depends on the scope of the damage and the pace of repairs. Even where power has been restored, the authorities in many cities have been instituting up to 18-hour power outages to prevent overloading the limited capacity of the country's energy infrastructure that remains operational.

The laws of war prohibit attacks on civilian objects, but also on military targets if the attack may be expected to cause excessive civilian casualties, damage to civilian objects, or a combination, in relation to any concrete and direct military advantage anticipated. Russia has an obligation to do everything feasible to assess such proportionality before conducting any attack, and intentionally launching a disproportionate attack in the knowledge that civilian casualties and damage would be clearly excessive constitutes a war crime.

The laws of war also prohibit attacks on objects indispensable to the survival of the civilian population and violence or threats, "the primary purpose of which is to spread terror among the civilian population."

Attacks in October

Ukraine's Prime Minister Denys Shmyhal, stated on October 21, that between October 10 and 20, Russian missiles and drones damaged dozens of energy infrastructure objects in 16 of Ukraine's 24 regions.

The second wave of October attacks, starting from October 22, further reduced Ukraine's energy capacity, leading to extended blackouts in Kyiv, Zhytomyr, and Chernihiv regions.

Human Rights Watch reviewed police and fire brigade reports, authorities' statements, and news reports from October, and identified at least 22 separate attacks in the month that damaged such infrastructure objects as thermal power plants and hydro power stations in Kyiv and Kyiv region, Lviv, Dnipro, Krivyi Rih, Pavlohrad, Kharkiv and Kharkiv region, Konotop, Zhytomir, and Kremenchuk. Some of these attacks were also noted in a Washington Post investigation, published on October 17, which used satellite imagery and fire-tracking data to identify energy facilities in six regions of Ukraine that had been damaged or destroyed since October 10. Human Rights Watch did not independently corroborate The Washington Post's findings.

Ukrainska Pravda reported that on the morning of October 10, in Kyiv, drone and missile attacks severely damaged power plant number 5 and heat supply station number 1 (previously known as power plant number 3), which supplies heating and hot water to four districts of Kyiv.

Also on October 10, at around the same time, two missiles hit Trypilska cogeneration power plant in the Kyiv region, damaging the power plant's main building and the transformer

substation and resulting in a fire, which four regional fire departments were involved in extinguishing. The Trypilska plant is the only one that provides the city of Ukrainka, population 14,000, with heat and hot water. It also provides power to Kyiv, Cherkasy, and Zhytomir regions.

According to Kyiv municipal authorities, on October 31, a series of attacks destroyed 80 percent of Kyiv residents' water supply.

On the morning of October 10, three strikes were carried out on Kharkiv's energy infrastructure objects, cutting off water and electricity in some parts of the city.

In an October 21 interview, Ukraine's energy minister, German Galushenko, estimated the damage to Ukraine's energy infrastructure to be "at least half of thermal (power) generation capacity, even more."

On November 4, Kyiv's mayor, Vitalii Klychko, stated on his Telegram channel that more than 450,000 Kyiv residents had no electricity, adding that the number was 1.5 times higher than in previous days.

Attacks in November

On November 15, a wave of missile attacks hit critical infrastructure across the country. According to the Ukrainian government and the Ukrainian Air Force, the strikes involved approximately 100 missiles that mostly targeted infrastructure but also damaged civilian buildings and caused civilian casualties in at least 16 regions. The attacks caused widespread power outages in Kyiv, witnessed by Human Rights Watch researchers, and hit three apartment buildings in Kyiv's Pechersky district, killing at least one civilian.

On November 16, the office of the prosecutor general reported there had been 92 attacks on Ukraine's energy infrastructure carried out in October and November.

On November 23, Russia launched at least 70 missiles on infrastructure targets in Ukraine, leaving millions of people without electricity and water, for hours and sometimes for days, depending on the region. For example, according to official data, nearly 80 percent of the population of Kyiv lost access to electricity and water supply immediately following the attack.

Lviv Energo said that as of November 29, most energy consumers in Lviv had daily emergency power shutdowns due to network overload. One central Lviv resident told Human Rights Watch that in the six days since the November 23 attacks, her family, including a 4-year-old child, has faced eight to 10-hour power cuts daily, and when the electricity comes on, there is not enough to heat their two-bedroom apartment. The outdoor Lviv temperature in late November hovered between 0 and minus 3 degrees Celsius.

A woman who lives in another Lviv neighborhood said that on November 28, residents in her building did not have power for 16 hours. For two weeks before that, her building had 10-to-18-hour power cuts every other day.

The November 23 attacks also led Ukraine's four operational nuclear power plants to be disconnected from the national energy grid. Although the power was restored a day later, Kharchenko of the Energy Industry Research Centre consulting group said that this represented "a huge problem for [Ukraine's] energy supply as a whole."

Interior Minister Denys Monastyrskyi said that the November 23 attacks damaged three residential buildings and killed 10 people. One of the attacks on November 23 hit just outside a four-story residential building in Vyshgorod, Kyiv region. While Human Rights Watch is not in a position to identify the intended target, the attack may have been aimed at Kyyivs?ka Haes, a pumped-storage power station, or the Kyiv Hydroelectric Power Plant, 3.8 and 2.3 kilometers from the site, respectively.

The aftermath of the November 23 attack outside of the residential building at Mykhaila Hrushevs'koho Street 1, Vyshgorod, Kyiv region. November 24, 2022. © 2022 Yulia Gorbunova/ Human Rights Watch

On November 24, Human Rights Watch researchers visited the site of the attack, a residential building at Mykhaila Hrushevs'koho Street 1, and observed the extensive damage to it. The munition hit less than a meter from the building, significantly damaging the building's roof and façade and causing a fire that further damaged the building and the cars parked outside. The two neighboring residential buildings, at Mykhaila Hrushevs'koho Street, 3 and Mykhaila Hrushevs'koho Street, 5 were also damaged by the explosion wave.Human Rights Watch researchers examined the impact crater, approximately 1.5-2 meters wide, and saw and photographed remnants of the weapon that was still in it. Rescue workers on site provided researchers with a photo of a remnant of the weapon that included numeric markings.

Rescue workers and residents on site said that at least three of the building's residents were killed in the attack, but that the real numbers were likely to be higher. On November 27, the Kyiv police chief stated on his Telegram channel that the attack killed seven residents of the building and injured 35, including six children.

"I was in my living room when I heard the explosion. It was around 2:10 or 2:15 in the afternoon. I was near the window. It [the explosion] hit so strong that it made me somersault backwards across the room." Fyodor said that the explosion blew out all the windows in his apartment and that his children, ages 2 and 8, who were at home with him and in the same room, were covered in glass.

It was his daughter's birthday. Fyodor grabbed the children and ran outside, where he saw the building's entrance and cars parked nearby were on fire. He also said that his first-floor neighbor, Volodymyr K, was smoking outside when the attack occurred and was instantly killed. His sisters identified his body in the morgue, Fyodor said. A woman in her late 40s told Human Rights Watch that her mother, who lived on the second floor of the same building and was alone at home during the attack, was pinned to the floor by a wardrobe that fell on her and that she had suffered an injury to her calf.

# "Thousands have lived without love, not one without water"

**It is alarming that only 20 per cent of the entire population has access to clean drinking water.**

MUHAMMAD USMAN

Water is essential, a source for all life. It covers more than two thirds of the planet, where most is undrinkable salt water from oceans and seas. Only 0.5 per cent of the earth's total water is fresh water that can be used in daily activities.

Pakistan was once considered the most water-rich country, but it is now facing water shortage problems in its urban and rural areas. Despite being a heated topic, there is still uncertainty about the nature of the country's water crisis, and exploring the water crises in Pakistan will offer possible solutions and better understanding to these basic water problems.

Pakistan owes its water crisis to the inaccessibility of drinkable water, water scarcity, institutionalisation and poor management of water resources, and the impending dangers of climate change. It is facing severe problems with the management and accessibility of clean water, particularly in the expanding metropolis like Karachi where the problem is more severe. It is alarming that only 20 per cent of the entire population has access to clean drinking water. Industrial and residential trash being thrown into rivers and lakes is the main reason for the poor quality of the water. This aspect directly affects people's health as they are at risk of contracting water-borne diseases. As per figures, 15 per cent of the child population dies due to diarrhoea.

When the British departed the Indian Subcontinent, they did not anticipate how India and Pakistan would share the Indus River System. As all the rivers flow from India to Pakistan, India cut off complete water supply to Pakistan soon after independence from the British. After this incident, both countries plunged into a war that allowed the World Bank to work as arbitrators to solve the issues. This led to the Indus Water Treaty, according to which Pakistan received the western rivers of the Indus River System (Indus, Jhelum, Chenab), while India received the eastern ones (Ravi, Beas, Sutlej).

The population of India has grown significantly over time, and as a result, their water needs have also increased tremendously. India has constructed multiple dams on rivers in Pakistan because of its increasing water and power demands. Due to a long history of conflicts between the two nations, this act of India has become a source of disagreement. Pakistan's water demands have not yet been affected by the Indian dam plans, but it will indeed affect Pakistan in the future.

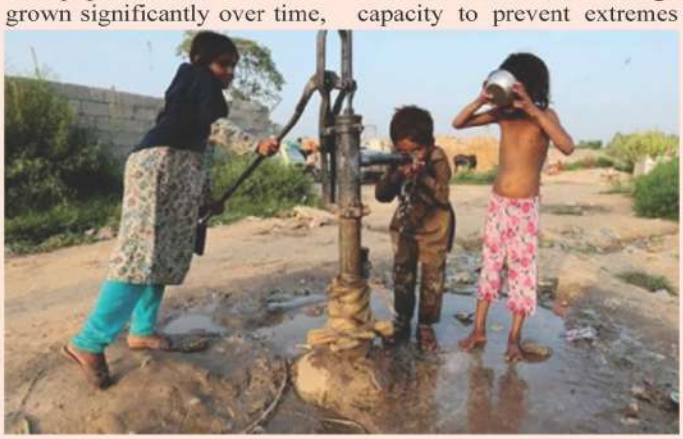

Water is a significant point of contention in local politics. Dam construction is the top political concern in Pakistan. Smaller provinces like Sindh and Balochistan worry that some dam development projects will dry up their agricultural fields. The Indus River System Authority (IRSA) distributes water between all four provinces. Sindh, however, claims that Punjab is consuming more than its fair share through flood irrigation.

Pakistan also lacks water storage facilities like dams, which often result in water scarcity and flooding across the country. In 1976, the water storage capacity of Pakistan was 16.27 million acre-feet (MAF), which has decreased to 13.67 MAF, a hardly 30 days' storage capacity. Pakistan must enhance its water storage capacity to prevent extremes like droughts and floods. The recent flooding of 2022 caused $45 billion to Pakistan's unstable economy. These floods will only worsen if we work on enhancing the country's water storage capacity. Moreover, the institutional arrangements for managing the water resources of Pakistan are one of the biggest problems. The poor management of the water resources has increased the political problems that make it challenging to find solutions to the water dilemma.

One of the most alarming issues is climate change at present. Pakistan is ranked among the 10 countries most vulnerable to the effects of climate change. The recent flooding of 2022 is one of the signs of what is to come. Water problems will surely get worse due to climate change. Supply of fresh water is being depleted and flooded due to the melting glaciers in the north. In short, Pakistan has a challenging future ahead in terms of water problems.

Possible solutions for Pakistan must begin with gathering information and conducting a requirements analysis to address the country's water crisis. Basic information on Pakistan's water resources and depletion rate has yet to be made available. Most of the data used in the water projects are hypothetical or based on expert judgement. Water requirements for all needs are also necessary. The Pakistan Council of Research in Water Resources (PCRWR) is assessing crop water requirements, which is essential for residential consumption and all economic sectors.

Pakistan also needs to manage its water resources effectively. The economy, employment, and size of the agriculture sector are all declining, but still it is responsible for most water usage. We should switch to a shower in place of the flood irrigation technique. But we need to implement the shower technique in rice farming. Another measure is to charge a use-based price for water usage instead of a fixed fee. This measure will encourage water conservation.

Pakistan must also build water filtration facilities to give its citizens safe drinking water. Moreover, it must clean the lakes and rivers that supply water to its cities. We must also build more storage facilities. Smaller and bigger dams should be constructed that do not spark political conflict.

We are facing a severe water problem, but our timely attention can manage this problem. Problem-solving is difficult due to the politics around water, and resource mismanagement is making matters worse. A water conservation mindset must be instilled in the people, and water waste in agriculture must be considered

# Climate justice: Is the world ready to compensate Pakistan?

## Leading COP27's agenda was a historic moment for Pakistan.

Annie Shabbir

The establishment of the Fund for Loss and Damage by COP27 has been lauded as a great achievement of Pakistan's foreign policy. This fund will address losses and damages due to climate change in developing countries. Pakistan expressed its hope that the fund's operationalisation would reduce disparities in the climate finance architecture. Pakistan vows to contribute constructively to global climate change negotiations and policy actions.

Pakistan's Foreign Minister Bilawal Bhutto Zardari has remarked that including the fund on the COP27's agenda is a sign of optimism. Amid all the hopes of equitable treatment to deal with the existential threat of climate change, here the question arises: is the world ready to compensate Pakistan for a man-made crisis?

Despite being one of the most vulnerable countries to climate change, Pakistan has championed the case of climate justice not only for itself but all G77. Pakistan has to pass a lengthy process between conceptualising an idea and turning it into policy action. Certain constraints make the practical possibilities of climate justice a long and tortuous process. Before discussing these constraints, we first need to understand what Pakistan expects in terms of climate justice. The tentative features of climate justice are debt relief, time-bound financing for energy transition, de-growth and cutting down emissions in the Global North.

When a highly indebted developing country like Pakistan is affected by climate change, debt relief becomes an essential part of policy response to meet its emergency needs. Repayment of loans coupled with the cost of rebuilding makes it difficult for an economy to recover. A Debt Service Suspension Initiative (DSSI) was carried out by World Bank and International Monetary Fund (IMF) in 2020 to let countries use financial resources to fight the Covid-19 pandemic. Such an initiative was not extended to extreme climate events, with Pakistan currently needing a fiscal space to adapt to climate shocks and debt relief would be crucial to overcoming the fiscal deficit.

One of the biggest constraints for any international initiative for debt relief is the Russia-Ukraine war and the international economic situation developed consequently. According to the Organisation of Economic Cooperation and Development (OECD), the world's leading economies are going through a recession and steep inflation due to the Russia-Ukraine war. It has cut growth by more than previously predicted. The OECD further remarked that central banks need to hike rates to overcome inflation, predicting that major central banks' policy rates would be increased at least four per cent in 2023. Although the World Bank has warned that such a rate hike would hurt the economy of developing countries the most. In this regard, another constraint is the geopolitical rivalry between eastern and western creditors. The Paris Club is a group of rich western creditor countries. Their biggest apprehension is that debt relief would end up benefitting Chinese firms, which have been funding infrastructural build-ups in developing countries for the past decade.

China, on the other hand, shows concerns that if it proceeds with a cut in principal and interest payments, then the money would go to American dominant financial institutions like the IMF and World Bank. These apprehensions between both sides have hurt debt relief efforts which began under the DSSI. The International Energy Agency (IEA) has urged countries worldwide to speed up their transition to clean energy to ward off the disastrous effects of climate change. Energy is profoundly essential in poverty alleviation, it achieves better health and education facilities, builds infrastructure and industries, ensures food security and deals with extreme climate events. Finding ways to ensure these essentials in developing countries while avoiding high-carbon emissions is one of the biggest challenges in today's world.

Transitioning to clean energy is crucial for sustainable development in Pakistan and other developing countries. However, the strength of the investment in the energy sector is weaker because of the public health crisis, which also triggered a global economic recession. All around the world, there is less fiscal space to support economic activities. The Covid-19 pandemic has heightened pressure on financing and major investment players, practically reversing progress in expanding access to clean energy in developing countries.

The historical Carbon Dioxide (CO2) emissions in the atmosphere are due to economic activities carried out by highly industrialised countries or the Global North. Yet developing countries or Global South are facing most of the wrath unleashed by climate change due to these emissions. The general consensus among developing countries is that the Global North should lead efforts to reduce carbon emissions and bear more responsibility for helping the Global South through the financing of infrastructure, clean energy and other emerging technologies.

The US alone is responsible for 25 per cent of global emissions, the highest in the world. It also plays an important role in climate negotiation and global policy-making. The US has come up with a climate law which roughly offers $400 billion worth of incentives to finance the transition to green energy. It also includes subsidies for manufacturing electric cars and promoting industries such as renewable energy and batteries. French President Macron has expressed concerns that such policies will create fragmentation in the West. It will disrupt market competition through massive subsidies to American companies and will undermine European industries.

"Perhaps this law will solve your problems but it will make mine worse," he said.

He has called on the EU to formulate the 'Buy European Act,' which will offer similar subsidies to domestic industries. Thus, the economic interests of the West make the transition to green energy very complex.

Leading COP27's agenda was a historic moment for Pakistan. It urged the developing countries to mobilise on the issue of climate justice. The Pakistani officials highlighted the urgency to tackle climate-related issues, or else they will continue suffering the consequences of climate change. Pakistan's robust foreign policy action on climate change is commendable. At the same time, Pakistan needs a holistic approach which looks at climate change from all angles going from micro to macro. It should also aim to address a constructive aspect of climate security, i.e. something is considered a security problem when it is securitised. The securitisation would allow policymakers to view Pakistan's environmental challenges through a three-level framework: local, international and structural.

# 'Pakistan may face alarming level of water scarcity by 2025'

Dr Zulfiqar A Bhutta, founding director of the Aga Khan University's Institute for Global Health and Development, Tuesday underscored the nexus of water security and nutrition in Pakistan, stressing that one cannot be managed without sustaining the other.

"Water is an equal threat as nutrition to the development of the country. By 2016, there were only 1,000 cubic metres of water left for each person in Pakistan – which is the borderline requirement," Dr Bhutta said, addressing a seminar titled 'Climate Change and Water-related Challenges in Pakistan: Tangible Solutions'.

Pakistan may face alarming level of water scarcity by 2025

The two-day conference brought together national and global scientists, policy advisors, experts, as well as climate change officials from the provincial and federal governments to share their evidence-based views on how water safety, security, and population health can be achieved.

The conference was organised by the AKU's IGHD and the national hub of the United Nations' Sustainable Development Solutions Network.

Experts at the seminar reiterated that water scarcity has become a serious threat to Pakistan's sustainable development and economic growth. In addition to surface water, Pakistan's groundwater resources — the last resort of water supply — are severely overdrawn, mainly to supply water for irrigation.

If the situation remains unchanged, as per experts, Pakistan may face an alarming level of water scarcity by 2025.

These views were expressed by scientists and policy advisors speaking at a seminar on 'Climate Change and Water-related Challenges in Pakistan: Tangible Solutions' organised by the Aga Khan University's Institute for Global Health and Development and the national hub of United Nations' Sustainable Development Solutions Network.

Also present at the event, Aga Khan Professor at the Massachusetts Institute of Technology Professor James Wescoat spoke about climate change and critical water problems in the Indus Basin of Pakistan.

He expressed serious concerns about increased flooding and drainage problems getting worse by 2050, especially in the lower Indus Basin.

"We must support bold and pragmatic approaches to reconstruction, including water and climate research networks and Indus Basin models with health and well-being at the core," he said in his keynote address.

Karachi Ubran Lab's Dr Nausheen H Anwar underscored that Pakistan needs resilient cooling pathways in the face of rising temperature and extreme heatwaves. "For cooling resiliency and adaptation, Pakistan needs reliable, affordable, and sustainable energy," she said.

Experts at the event shared that Pakistan ranked 14th among the 17 'extremely high baseline water stress' countries of the world, as per the World Resources Institute.

However, water stress is just one dimension of water security. Like any challenge, its outlook depends on management. Some of the most arid and water-stressed countries, including Saudi Arabia and Namibia, have effectively secured their water supplies through proper management.

Around 96% of Pakistan's freshwater is used for agriculture, a sector which constituted nearly 23% of its GDP in 2021. Nevertheless, the country continues to depend on a single river system and unreliable water infrastructure.

Adding to these factors are impacts of climate change, including frequent floods, droughts, and the accelerated melting of glaciers in the country's north. The health and nutrition consequences of the large-scale devastation caused by a recent episode of floods are unfortunate examples and call for urgent and collaborative action at all governance and policy levels.